’’میں صرف سیر اور آپ سے ملنے کے لیے آ گیا تھا۔‘‘
وہ بولیں
’’شادی کا کیا ہوا سنا ہے تم میں اور تمہارے گھر والوں میں شادی کے مسئلے پر سخت اختلاف ہوگیا ہے۔‘‘
جی ہاں...... شادی کا مطلب ہے کہ یا تو میں امی کی پسند کے مطابق ایک احمق لڑکی سے شادی کرلوں یا پھر چپ بیٹھا رہوں۔‘‘
’’اور وہ جمیلہ......تم جمیلہ سے شادی کرنا چاہتے تھے نا؟‘‘
بھابھی جان بولیں...... میں نے کہا۔
’’اب بھی چاہتا ہوں لیکن امی نے کہہ دیا کہ جمیلہ اس گھر میں بہو بن کر داخل نہیں ہوسکتی۔‘‘
’’یوں تو بڑی زیادتی ہے۔‘‘
بھابھی جان بولیں ......میں نے کہا۔
’’ہے تو ......لیکن کیا کیا جائے بہت ظلم برداشت کرنے پڑتے ہیں۔‘‘
’’پھر کیا سوچا ......‘‘
بھابھی جان نے پوچھا ...... میں نے اپنے لفظوں پر زور دے کر کہا۔
’’شادی تو جمیلہ ہی سے کروں گا اور گھر چھوڑ دوں گا۔‘‘
’’تو بسم اللہ؛ بیاہ کرکے آجاؤ۔ یہاں میرے ساتھ رہے گی۔ میں بھی اکیلی ہوں۔‘‘
’’اُف‘‘ بھابھی کی بات سن کر میرا سر چکرا گیا۔ یہ عورت ہے یا عزم و ہمت کا ستون۔ اپنے لیے ہر روز ایک نیا بوجھ بڑھائے جاتی ہے۔ خود اپنی ضرورتیں اور ذمہ داریاں کیا کم ہیں مگر ہمت ہے اور ہمت کے سہارے شوہر کی دوری اور نظر بندی کا غم ہنس ہنس کر بھلائے جاتی ہے۔ میں نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔
’’میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ لیکن ابھی دیر ہوگی۔ جمیلہ ابھی بیمار ہے۔‘‘
جمیلہ بیمار نہیں تھی بالکل اچھی تھی مگر میں یہ نہیں کہتا تو وہ ضد پر اتر آتیں۔ حالانکہ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ بھابھی جان سے مشورہ کرنے کے بعد شادی کروں گا اور اسے ان کے پاس چھوڑ کر نوکری کی تلاش میں نکلوں گا۔ بھابھی جان جمیلہ کی بیماری کی خبر سن کر افسوس کرنے لگیں اور بولیں۔
’’سچ مچ جمیلہ بڑی پیاری لڑکی ہے۔‘‘
میں باہر چلا گیا اور طے کرلیا کی گاڑی سے واپس چلا جاؤں۔
چار بجے واپس آیا تو دیکھا بھابھی جان بہت اداس بیٹھی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ٹیلی گرام تھا جس کو ہاتھ میں لیے بس دیکھتی جارہی تھیں۔ ان کے چہرے کا گورا رنگ سانولا گیا تھا۔ میں چپ ان کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔
’’ٹیلی گرام کیسا ہے بھابھی جان۔‘‘

''اختر۔''

جیسے وہ چیخ پڑیں۔ تار میرے ہاتھ میں دے دیا اور میز پر سر رکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، ننھے بھائی کو چار سال کی سزا ہوگئی تھی۔ میں نے کچھ دیر کے بعد بمشکل کہا۔

''بھابھی جان صبر کیجیے۔ ابھی تو امتحانوں کی منزل سے اور بھی گزرنا ہوگا۔''

اور بھابھی جان کو جیسے سکون آ گیا۔

''ٹھیک کہتے ہو اگر میں پریشان ہوئی تو بچّے اور پریشان ہوں گے۔''

وہ اٹھیں اور منہ ہاتھ دھونے چلی گئیں۔ جب واپس آئیں تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک لہر تھی جو آئی اور گزر گئی، لیکن ہم لوگ جتنی دیر تک چائے پیتے رہے بھابھی جان کی نظریں بار بار سنگار میز پر رہی بھائی جان کی تصویر کا طواف کرتی رہی۔ اسی وقت انھوں نے بتایا کہ ان کے پاسپورٹ کی درخواست نا منظور ہوگئی ہے اور اسی رات ان کا دہلی جانا ضروری ہوگیا ہے۔

اسی رات بھابھی جان دہلی چلی گئیں اور میں واپس ہوگیا۔ رات کے سنّاٹے میں ریل گزرتی جاتی تھی اور مجھے ایسا معلوم ہورہا تھا کہ اندھیری رات میں بھابھی جان مجھے روشنی دکھا رہی ہیں۔ میرے دل میں نئے ارادے، نئے حوصلے پیدا ہورہے تھے۔ نئی امیدیں، اور نئی امنگیں جاگ رہی تھیں۔

الفاظ و معانی

احتجاج مخالفت **طواف** کسی چیز کے اردگرد گھومنا **نوابانِ اودھ** اودھ کے نواب **جھینپ جانا** شرمندہ ہونا **جبر** ظلم **فرلانگ** دو سو بیس گز کا فاصلہ **ماہوار** ہر مہینہ **دل شکنی** دل توڑنا **علت** بیماری **باوقار** جاہ و جلال **اصرار** ضد

1. سوالات کے جوابات لکھیے :

(1) رقیہ بھابھی کی ذات کو شمع کیوں کہاں ہے؟

(2) بھابھی جان اداس کیوں ہوگئیں؟

(3) رقیہ بھابھی نے سوئٹر اور موزے کس کے لیے بنوائے تھے؟

(4) بھابھی جان خط لکھنے کے شوق کو کیا سمجھتی تھیں؟

(5) رقیہ بھابھی نے شمّی کی کس طرح مدد کی؟

(6) رقیہ بھابھی نے کس کے لیے چوڑیاں خریدیں تھیں؟

(7) ٹیلی گرام میں کیا لکھا تھا؟

2. **تفصیلی جواب لکھیے :**

(1) وہ آدمی نہیں مشین تھیں۔ سمجھائیے۔

(2) بھابھی جان کی مصروفیات تفصیل سے بیان کیجیے۔

(3) رقیہ بھابھی عزم و ہمت کا ستون ہے۔ ایسا کیوں کہا گیا ہے؟

3. **جملہ کون کس سے کہتا ہے ؟ لکھیے :**

(1) چائے پینے کے بعد دوسری قسط سو لینا۔

(2) شعر کہوں گا اور کیا کروں گا۔

(3) اون بچ گیا تھا تو میں نے ٹوپی اور موزے بھی بُن دیے۔

(4) میں چائے پی چکی ہوں۔

4. **حروفِ عطف لکھیے : (پہچانیے)**

(1) دو مہینے پہلے اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے۔

(2) ابھی تو امتحانوں کی منزل سے اور بھی گزرنا ہوگا۔

5. **محاورہ کا معنی بتا کر جملہ بنائیے :**

احتجاج کرنا، جھینپ جانا، راہ تلاش کرنا، پھوٹ پھوٹ کر رونا،

6. **مرکب الفاظ کی ترتیب بتائیے :**

دل کشی، باوقار، بمشکل، قربان گاہ

7. **ہم معنی الفاظ ترتیب دے کر لکھیے :**

تاریک	جاگیر	عزم	خوشی
زمین	اندھیرا	صبر	قناعت
مسرت	ہمت	ظلم	جبر

●

11

گرمی اور دیہاتی بازار

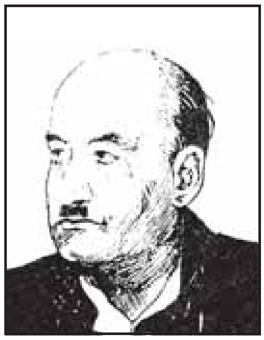

جوشؔ ملیح آبادی

پیدائش : 1894ء وفات 1982ء وطن : ملیح آباد

نام شبیر حسین خان اور جوشؔ تخلص کرتے تھے۔ اودھ کے ایک معزز جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوئے، لیکن جاگیرداروں کی عام روش کے مخالف رہے۔ آپ کے خاندان میں ہمیشہ علم و ادب کے چرچے رہے۔ والد کے بے وقت انتقال کی وجہ سے تعلیم کے میدان میں زیادہ نمایاں نہ ہوسکے۔ لیکن شعر وسخن میں جلد ہی منظر عام پر آگئے۔ فن شاعری میں عزیز لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ انہوں نے غزلیں بہت کم کہی لیکن مختلف النوع موضوعات پر بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ شاعری کے علاوہ صحافت میں بھی اپنے قدم جمائے ماہنامہ ''آج کل'' کے مدیر رہے۔ نیز آل انڈیا ریڈیو سے بھی منسلک رہے۔ ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد دکن میں بھی قیام رہا۔

آزادئ فکر، حُسنِ تخیل، لطافت اور اظہار کی بے تکلفی جوشؔ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ منظر نگاری جوش کی شاعری کا جادو ہے۔ ان کے کئی مجموعہ کلام چھپ چکے ہیں۔ ''یادوں کی بارات'' جوشؔ کی آپ بیتی ہے۔ جو ان کی مشہور و معروف تصنیف ہے۔

''گرمی اور دیہاتی بازار'' جوش کی ایک ایسی نظم ہے جس میں دیہات میں موسمِ گرما کا سماں بڑے پُر اثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دیہاتی زندگی کے مختلف پہلو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

دوپہر، بازار کا دن، گانو کی خلقت کا شور
خون کی پیاسی شعاعیں روح فرسا لؤ کا زور

آگ کی رو، کاروبارِ زندگی کا پیچ و تاب
تند شعلے، سرخ ذرّے، گرم جھونکے، آفتاب

شور، ہلچل، غلغلہ، ہیجان، لو، گرمی، غبار
بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں قطار اندر قطار

مکھیوں کی بھنبھناہٹ، گُڑ کی بو، مرچوں کی دھانس
خربزے، آلو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز، گھانس

دھوپ کی شدت، ہوا کی یورشیں، گرمی کی رو
کملیوں پر سرخ چاول، ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جو

گرم ذرّوں کے شدائد، جھکڑوں کی سختیاں
جھکڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کا دھنواں

مردوزن گردش میں چیلوں کی صدا سنتے ہوئے
چلچلاتی دھوپ کی رہ میں چنے بھنتے ہوئے

میان سے موسم کی تیغ بے اماں نکلی ہوئی
پیاس سے انسان و حیواں کی زباں نکلی ہوئی

آسماں پر ابر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا رم
نشّے میں ممسک کا جیسے وعدۂ جو دو کرم

ہر روش پر چڑ چڑاپن، ہر صدا میں بے رخی
ہر جگہ پھکتا ہوا ہر کھوپڑی پکتی ہوئی

سر پہ کافر دھوپ جیسے روح پر عکس گناہ
تیز کرنیں جیسے بوڑھے سود خواروں کی نگاہ

الفاظ و معانی

خلقت مخلوق **روح فرسا** روح کو تباہ کرنے والا خوفناک، خطرناک **غلغلہ** شور، ہنگامہ، ہیجان، تیزی، زور، جوش **یورش** یورشیں کی جمع، حملہ **خرپزہ** خربوزہ **جھکڑ** آندھی **رم** بھاگنا **ممسک** کنجوس، بخیل، روکنے والا **گردش** چکر میں آنا، مصیبت میں پھنسنا

مشق

.1 مندرجہ ذیل سوالات کے جواب لکھیے :

(1) بازار میں لوگ کیوں پریشان ہیں؟

(2) شاعر نے بازار کی منظرکشی میں کن کن چیزوں کا ذکر کیا ہے؟

(3) دھوپ کی شدت کا لوگوں پر کیا اثر ہو رہا ہے؟

(4) تیز کرنوں کو شاعر نے کس سے تشبیہہ دی ہے؟

.2 مندرجہ نظم سے ''تشبیہ'' کے اشعار تلاش کیجیے۔

●

12 اوورکوٹ

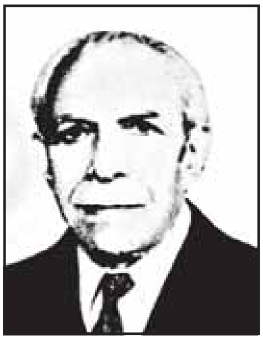

غلام عباس

پیدائش : 1909ء وفات : 1982ء

امرتسر میں پیدا ہوئے۔ غلام عباس نے لاہور میں تعلیم حاصل کی اور یہیں سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ وہ عرصہ تک بچوں کا رسالہ 'پھول' مرتب کرتے رہے اور مولوی ممتاز علی کی ادبی سرگرمیوں میں شریک رہے۔ ان کی ادبی شہرت کا آغاز ''جزیرۂ سخنوراں'' سے ہوا۔ وہ ریڈیو پاکستان کے رسالہ ''آہنگ'' کے بھی مدیر رہے۔ غلام عباس نے 'آنندی' لکھ کر اردو ادب میں اپنا مقام پیدا کرلیا۔

غلام عباس کے افسانوں میں یکسانیت نہیں ہوتی۔ ان کے ہاں خاصا تنوع ہے وہ ہماری معاشرتی زندگی کو نہ کریدتے ہیں اور نہ مصلح بن کر اپنے نظریات منواتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے کردار نیک ہوتے ہیں اور جہاں ان کے کرداروں میں ایک نا معلوم مجرمانہ خواہش ابھرتی ہے وہیں ان کے عقائد اور خیالات میں ایک خاص کشمکش شروع ہوجاتی ہے۔

غلام عباس کی طرز تحریر صاف اور رواں ہوتی ہے۔ "آنندی" اور "جاڑے کی چاندی" ان کے مشہور افسانوی مجموعے ہیں۔

یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ یہ مغربی تہذیب کی علامت ہے۔ دیکھا جائے تو کئی چیزوں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ سردی، گرمی اور بارش میں بڑے کام کی چیز ہے۔ اس کہانی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک معمولی حیثیت کا شخص جو مغربی تہذیب میں رنگا ہوا ہے۔ مہذب لب و لہجہ جانتا ہے اور جسم پر زیب تن کیے ہوئے اوورکوٹ سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔ دوکاندار اس سے شخصیت سے مرعوب ہوجاتے ہیں، لیکن آخر میں پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک معمولی حیثیت کا شخص ہے۔

یہ ہفتے کی شام تھی۔ بھرپور جاڑے کا زمانہ۔ سرد اور تند ہوا کسی تیز دھات کی طرح جسم پر آ آ کے لگتی تھی۔ مگر اس نوجوان پر اس کا کچھ اثر نہیں معلوم ہوتا تھا اور لوگ خود کو گرم کرنے کے لیے تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے۔ مگر اسے اس کی ضرورت نہ تھی جیسے اس کڑکڑاتے جاڑے میں اسے ٹہلنے میں بڑا مزہ آرہا ہو۔

اس کی چال ڈھال سے ایسا بانکپن ٹپکتا تھا کہ تانگے والے دور ہی سے دیکھ کے سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کی طرف لپکتے۔ مگر وہ چھڑی کے اشارے سے انہیں کردیتا۔ ایک خالی ٹیکسی بھی اسے دیکھ کر رُکی۔ مگر اس نے ''نوتھینک یو'' کہہ کر اسے بھی ٹال دیا۔

جیسے جیسے وہ مال کے زیادہ با رونق حصّے کی طرف پہنچتا جاتا تھا۔ اس کی چونچالی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ منہ سے سیٹی بجا کے رقص کی ایک انگریزی دھن نکالنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پاؤں بھی تھرکتے ہوئے اٹھنے لگے۔ ایک دفعہ جب آس پاس کوئی نہیں تھا تو یکبارگی کچھ ایسا جوش آیا کہ اس نے دوڑ کر جھوٹ موٹ ٹال دینے کی کوشش کی۔ گویا کرکٹ کا میچ ہورہا ہو۔

راستے میں وہ سڑک آئی جو لارنس گارڈن کی طرف جاتی تھی۔ مگر اس وقت شام کے دھندلکے اور سخت کہرے میں اس باغ پر کچھ ایسی اداسی برس رہی تھی کہ اس نے ادھر کا رُخ نہ کیا اور سیدھا چیرنگ کر اس کی طرف چلتا رہا۔

ملکہ کے بُت کے قریب پہنچ کر اس کی حرکات و سکنات میں کسی قدر متانت پیدا ہوگئی۔ اس نے اپنا رومال نکالا جیسے جیب میں رکھنے کے بجائے اس کوٹ کی بائیں آستین میں اڑس رکھا تھا اور ہلکے ہلکے چہرے پر پھیرا۔ تاکہ کچھ گرد جم گئی ہو تو اتر جائے۔ پاس گھاس کے ایک ٹکڑے پر کچھ انگریز بچے ایک بڑی سی گیند سے کھیل رہے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھنے لگا بچے کچھ دیر تک اس کی پروا کیے بغیر کھیل میں مصروف رہے۔ مگر جب وہ برابر تکے ہی چلا گیاتو وہ رفتہ رفتہ شرمانے سے لگے اور پھر اچانک گیند سنبھال کر ہنستے ہوئے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے دو گھاس کے اس ٹکڑے ہی سے چلے گئے۔

نوجوان کی نظر سمینٹ کی ایک خالی بنچ پر پڑی اور وہ اس پر آکے بیٹھ گیا۔ اس وقت شام کے اندھیرے کے ساتھ ساتھ سردی اور بھی بڑھتی جارہی تھی۔ اس کی یہ شدت ناخوشگوار نہ تھی۔ بلکہ لذت پرستی کی ترغیب دیتی تھی۔ شہر کے عیش پسند طبقے کا تو کہنا ہی کیا وہ تو اس سردی میں زیادہ ہی کھیل کھیلتا ہے تنہائی میں بسر کرنے والے بھی اس سردی سے ورغلائے جاتے ہیں اور وہ اپنے اپنے کونوں کھدروں سے نکل کر محفلوں اور مجمعوں میں جانے کی سوچنے لگتے ہیں تاکہ جسموں کا قرب حاصل ہو۔ حصول لذت کی یہی جستجو لوگوں کو مال پر کھینچ لائی تھی اور وہ حسب توفیق ریستورانوں، کافی ہاؤسوں، رقص گاہوں، سنیماؤں اور تفریح کے دوسرے مقاموں پر محظوظ ہورہے تھے۔

مال روڈ پر موٹروں، تانگوں اور بائیسکلوں کا تانتا بندھا ہوا تو تھا ہی پٹری پر چلنے والوں کی بھی کثرت تھی۔ علاوہ ازیں سڑک کی دو رویہ دکانوں میں خرید و فروخت کا بازار بھی گرم تھا۔ جن کم نصیبوں کو نہ تفریح طبع کی استطاعت تھی نہ خرید و فروخت کی وہ دور ہی سے کھڑے کھڑے ان تفریح گاہوں اور دکانوں کی رنگا رنگ روشنیوں سے جی بہلا رہے تھے۔

نوجوان سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھا اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے زن و مرد کو غور سے دیکھ رہا تھا اس کی نظر ان کے چہروں سے کہیں زیادہ ان کے لباس پر پڑتی تھی۔ ان میں ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ تھے۔ بڑے بڑے تاجر۔ سرکاری افسر، لیڈر، فنکار، کالجوں کے طلبا اور طالبات، نرسیں، اخباروں کے نمائندے دفتروں کے بابو۔ زیادہ تر لوگ اوورکوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہر قسم کے اوور کوٹ قراقلی کے بیش قیمت اوور کوٹ سے لے کر خاکی پٹی کے پُرانے فوجی اوور کوٹ تک جسے نیلام میں خریدا گیا تھا۔

نوجوان کا اپنا اوور کوٹ تھا تو خاصا پُرانا۔ مگر اس کا کپڑا خوب بڑھیا تھا۔ پھر وہ سلا ہوا بھی کسی ماہر درزی کا تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کہ بہت دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ کالر خوب جما ہوا تھا۔ باہوں کی کریزیں بڑی نمایاں، سلوٹ کہیں نام کو نہیں بٹن سینگ کے بڑے بڑے چمکتے ہوئے نوجوان اس میں بہت مگن معلوم ہوتا تھا۔

ایک لڑکا پان بیڑی سگریٹ کا صندوقچہ گلے میں ڈالے سامنے سے گزرا نوجوان نے آواز دی۔

''پان والا۔''

''جناب؟''

''دس کا چینج ہے؟''

''ہے تو نہیں۔ لادوں گا۔ کیا لیں گے آپ؟''

''نوٹ لے کے بھاگ گیا تو؟''

''اجی واہ۔ کوئی چور اُچکا ہوں جو بھاگ جاؤں گا۔ اعتبار نہ ہو تو میرے ساتھ چلیے۔ لیں گے کیا آپ؟''

''نہیں نہیں ہم خود چینج لائے گا۔ لو یہ اکنّی نکل آئی۔ گولڈفلیک کا ایک سگریٹ دے دو اور چلے جاؤ۔''

لڑکے کے جانے کے بعد مزے مزے سے سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ وہ ویسے ہی بہت خوش نظر آتا تھا۔ گولڈفلیک کے مُصفا دھوئیں نے اس پر سرور کی کیفیت طاری کردی۔

ایک چھوٹی سی سفید رنگ کی بلی سردی میں ٹھٹھری ہوئی نیچے اس کے قدموں کے پاس آ کر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ اس نے بچپکارا تو اچھل کر بنچ پر آ چڑھی۔ اس نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا :۔

''پوئر لٹل سول!''

اس کے بعد وہ بنچ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور سڑک کو پار کرکے اُس طرف چلا جدھر سنیما کی رنگ برنگی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ تماشا شروع ہو چکا تھا۔ سنیما کے برآمدے میں بھیڑ نہ تھی۔صرف چند لوگ تھے۔ جو آنے والی فلموں کی تصویروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ تصویریں چھوٹے بڑے کئی بورڈوں پر چسپاں تھیں۔ ان میں کہانی کے چیدہ چیدہ مناظر دکھائے گئے تھے۔

تین نوجوان اینگلوانڈین لڑکیاں ان تصویروں کو ذوق و شوق سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک خاص شان استغنا کے ساتھ مگر صنف نازک کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ مگر مناسب فاصلے سے ان تصویروں کو دیکھتا رہا۔ لڑکیاں آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتی تھیں اور فلم پر رائے زنی بھی۔ اچانک ایک لڑکی نے جو اپنی ساتھ والیوں سے زیادہ حسین بھی تھی اور شوخ بھی۔ ایک قہقہہ لگایا اور پھر وہ تینوں ہنستی ہوئی باہر نکل گئیں۔ نوجوان نے اس کا کچھ اثر قبول نہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خود بھی سنیما کی عمارت سے باہر نکل آیا۔

اب سات بج چکے تھے اور وہ مال کی پٹڑی پر پہلے کی طرح مٹرگشت کرتا ہوا چلا جارہا تھا۔ ایک ریستوراں میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ اندر سے کہیں زیادہ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ان میں زیادہ تر موٹروں کے ڈرائیور، کوچوان، پھل بیچنے والے جو اپنا مال بیچ کے خالی ٹوکرے لیے کھڑے تھے۔ کچھ راہ گیر جو چلتے چلتے ٹھہر گئے تھے کچھ مزدوری پیشہ لوگ تھے اور کچھ گداگر۔ یہ اندر والوں سے کہیں زیادہ گانے کے رسیا معلوم ہوتے تھے؛ کیونکہ وہ غل غپاڑ نہیں مچا رہے تھے، بلکہ خاموشی سے نغمہ سن رہے تھے، حالانکہ دھن اور ساز اجنبی تھے۔ نوجوان پل بھر کے لیے رُکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دور چل کے اسے انگریزی موسیقی کی ایک بڑی سی دکان نظر آئی اور وہ بلا تکلف اندر چلا گیا۔ ہر طرف شیشے کی الماریوں میں طرح طرح کے انگریزی ساز رکھے تھے۔ ایک لمبی میز پر مغربی موسیقی کی دو ورقی کتابیں چنی تھیں۔ یہ نئے چلنتر گانے تھے۔ سرورق خوب صورت رنگدار مگر دھنیں گھٹیا۔ ایک چھچھلتی ہوئی نظر ان پر ڈالی پھر وہاں سے ہٹ گیا اور سازوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ایک ہسپانوی گٹار پر جو ایک کھونٹی سے ٹنگی ہوئی تھی ناقدانہ نظر ڈالی اور اس کے ساتھ قیمت کا جو ٹکٹ لٹک رہا تھا اسے پڑھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک بڑا جرمن پیانو رکھا ہوا تھا۔ اس کا کور اٹھا کے انگلیوں سے بعض پردوں کو ٹٹولا اور پھر کور بندر کردیا۔

دکان کا ایک کارندہ اس کی طرف بڑھا۔

''گڈ ایوننگ سر۔ کوئی خدمت؟''

''نہیں شکریہ۔ ہاں اس مہینے کی گراموفون ریکارڈوں کی فہرست دے دیجیے۔''

فہرست لے کر اوورکوٹ کی جیب میں ڈالی۔ دکان سے باہر نکل آیا اور پھر چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا بک اسٹال پڑا۔ نوجوان یہاں بھی رُکا کئی تازہ رسالوں کے اورق اُلٹے۔ رسالہ جہاں سے اٹھاتا بڑی احتیاط سے وہیں رکھ دیتا اور آگے بڑھا تو قالینوں کی ایک دکان نے اس کی توجہ کو جذب کیا۔ مالک دکان نے جو ایک لمبا چغہ پہنے اور سر پر کلاہ رکھے تھا۔ گرم جوشی سے اس کی آؤ بھگت کی۔

''ذرا یہ ایرانی قالین دیکھنا چاہتا ہوں۔ اتاریئے نہیں یہیں دیکھ لوں گا۔ کیا قیمت ہے اس کی؟''

''چودہ سو بتیس روپے۔''

نوجوان نے اپنی بھنوؤں کو سُکیڑا جس کا مطلب تھا ''اوہو اتنی۔'' دکاندار نے کہا ''آپ پسند کر لیجیے۔ ہم جتنی بھی رعایت کر سکتے ہیں کر دیں گے''

''شکریہ لیکن اس وقت تو میں صرف ایک نظر دیکھنے آیا ہوں۔''

''شوق سے دیکھیے۔ آپ ہی کی دکان ہے۔''

وہ تین منٹ کے بعد اس دکان سے بھی نکل آیا۔ اس کے اوورکوٹ کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا جو ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا تھا۔ وہ اس وقت کاج سے کچھ زیادہ باہر نکل آیا تھا۔ جب وہ اس کو ٹھیک کر رہا تھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف اور پر اسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے پھر اپنی مٹرگشت شروع کر دی۔

اب وہ ہائی کورٹ کی عمارتوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اتنا کچھ چل لینے کے بعد اس کی طبیعت کی چونچالی میں کچھ فرق نہیں آیا تھا۔ نہ تکان محسوس ہوئی تھی نہ اکتاہٹ یہاں پٹری پر چلنے والوں کی ٹولیاں کچھ چھٹ سی گئی تھیں اور ان میں کافی فصل رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بید کی چھڑی کو ایک انگلی پر گھمانے کی کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی اور چھڑی زمین پر گر پڑی ''او سوری'' کہہ کر زمین پر جھکا اور چھڑی کو اٹھالیا۔

اس اثنا میں ایک جوان جوڑا جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل آیا۔ لڑکا دراز قامت تھا اور سیاہ کوڈرائے کی پتلون اور زپ والی چمڑے کی جیکٹ پہنے تھا اور لڑکی سفید ساٹن کی گھیردار شلوار اور سبز رنگ کا کوٹ۔ وہ بھاری بھرکم سی تھی۔ اس کے بالوں میں ایک لمبا سا سیاہ چٹلا گندھا ہوا تھا جو اس کی کمر سے بھی نیچا تھا۔ لڑکی کے چلنے سے اس چٹلے کا پھندنا اچھلتا کودتا پے درپے اس کے فربہ جسم سے ٹکراتا تھا۔ نوجوان کے لیے جو اب ان کے پیچھے پیچھے آرہا تھا یہ نظارہ خاصا جاذبِ نظر تھا۔ وہ جوڑا کچھ دیر تک خاموش چلتا رہا۔ اس کے بعد لڑکے نے کچھ کہا۔ جس کے جواب میں لڑکی اچانک چمک کر بولی:

''ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔''

''سنو میرا کہنا مانو'' لڑکے نے نصیحت کے انداز میں کہا ''ڈاکٹر میرا دوست ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔''

''نہیں، نہیں، نہیں''

''میں کہتا ہوں تمہیں ذرا تکلیف نہ ہوگی۔''

لڑکی نے کچھ جواب دیا۔

''تمہارے ماں باپ کو کتنا رنج ہوگا۔ ذرا ان کی عزت کا بھی تو خیال کرو۔''

''چپ رہو ورنہ میں پاگل ہوجاؤں گی۔''

نوجوان نے شام سے اب تک اپنی مٹرگشت کے دوران میں جتنی انسانی شکلیں دیکھی تھیں ان میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کیا تھا۔ فی الحقیقت ان میں کوئی جاذبیت تھی ہی نہیں، یا پھر وہ اپنے حال میں ایسا مست تھا کہ کسی دوسرے سے اسے سروکار ہی نہ تھا۔ مگر اس دلچسپ جوڑے نے جس میں کسی افسانے کے کرداروں کی سی ادا تھی۔ جیسے یکبارگی اس کے دل کو موہ لیا تھا اور اسے حد درجہ مشتاق بنا دیا کہ وہ ان کی اور بھی باتیں سنے اور ہوسکے تو قریب سے ان کی شکلیں بھی دیکھ لے۔

اس وقت اب تینوں بڑے ڈاک خانے کے چوارہے کے پاس پہنچ گئے تھے۔ لڑکا اور لڑکی پل بھر کو رُکے اور پھر سڑک پار کرکے میکلوڈ روڈ پر چل پڑے۔ نوجوان مال روڈ پر ہی ٹھہرا رہا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ فی الفور ان کے پیچھے گیا تو ممکن ہے انہیں شبہ ہوجائے کہ ان کا تعاقب کیا جارہا ہے۔ اس لیے اسے کچھ لمحے رُک جانا چاہیے۔

جب وہ لوگ کوئی سوگز آگے نکل گئے تو اس نے لپک کر ان کا پیچھا کرنا چاہا۔ مگر ابھی اس نے آدھی سڑک پار کی ہوگی کہ اینٹوں سے بھری ہوئی ایک لاری پیچھے سے بگولے کی طرح آئی اور اسے روندتی ہوئی میکلوڈ روڈ کی طرف نکل گئی۔ لاری کے ڈرائیور نے نوجوان کی چیخ سن کر پل بھر کے لیے گاڑی کی رفتار کم کی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی لاری کی لپیٹ میں آگیا اور وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاری کو لے بھاگا۔ دو تین راہ گیر جو اس حادثے کو دیکھ رہے تھے شور مچانے لگے نمبر دیکھو نمبر دیکھو۔ مگر لاری ہوا ہوچکی تھی۔

اتنے میں کئی اور لوگ جمع ہوگئے۔ ٹریفک کا ایک انسپکٹر جو موٹر سائیکل پر جارہا تھا رُک گیا۔ نوجوان کی دونوں ٹانگیں بالکل کچل گئی تھی۔ بہت سا خون نکل چکا تھا۔ اور وہ سسک رہا تھا۔

فوراً ایک کار کو روکا گیا اور اسے جیسے تیسے اس میں ڈال کے بڑے اسپتال روانہ کردیا گیا۔ جس وقت وہ اسپتال پہنچا تو اس میں ابھی رمق بھر جان باقی تھی۔

اس اسپتال کے شعبہ حادثات میں اسسٹنٹ سرجن خان اور دو نو عمر نرسیں مس شہناز اور مس گلِ ڈیوٹی پر تھیں۔ جس وقت اسے سٹریچر پر ڈال کے اپریشن روم میں لے جایا جارہا تھا تو ان نرسوں کی نظر اس پر پڑی۔ اس کا بادامی رنگ کا اوور کوٹ ابھی تک اس کے جسم پر تھا اور سفید سلک کا مفلر گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے کپڑوں پر جابجا خون کے بڑے بڑے دھبّے تھے۔ کسی نے ازراہِ دردمندی اس کی سبز فلیٹ ہیٹ اٹھا کے اس کے سینہ پر رکھ دی تھی تاکہ کوئی اڑا نہ لے جائے۔

شہناز نے گل سے کہا :

''کسی بھلے گھر کا معلوم ہوتا ہے بے چارہ۔''

گل دبی آواز میں بولی :

''خوب بن ٹھن کے نکلا تھا بے چارہ ہفتے کی شام منانے۔''

''ڈرائیور پکڑا گیا یا نہیں؟''

''نہیں بھاگ گیا۔''

''کتنے افسوس کی بات ہے۔''

اپریشن روم میں اسسٹنٹ سرجن اور نرسیں چہروں پر جراحی کے نقاب چڑھائے جنھوں نے ان کی آنکھوں سے نیچے کے سارے حصے کو چھپا رکھا تھا۔ اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ اسے سنگ مرمر کی میز پر لٹا دیا گیا۔ اس نے سر میں جو تیز خوشبودار تیل ڈال رکھا تھا۔ اس کی کچھ کچھ مہک ابھی تک باقی تھی۔ پٹیاں ابھی تک جمی ہوئی تھیں۔ حادثے سے اس کی دونوں ٹانگیں تو ٹوٹ چکی تھیں۔ مگر سر کی مانگ نہیں بگڑنے پائی تھی۔

اب اس کے کپڑے اتارے جارہے تھے۔ سب سے پہلے سفید سلک کا گلو بند اس کے گلے سے اتارا گیا۔ اچانک نرس شہناز اور نرس گل نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ چہرے جو دلی کیفیات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ جراحی کے نقاب تلے چھپے ہوئے تھے اور زبانیں بند۔

نوجوان کے گلوبند کے نیچے نکٹائی اور کالر کیا سِرے سے قمیص ہی نہیں تھی۔ اوور کوٹ اتارا گیا تو نیچے سے ایک بہت بوسیدہ اونی سوئٹر نکلا جس میں جابجا بڑے بڑے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں سے سوئٹر سے بھی زیادہ بوسیدہ اور میلا کچیلا ایک بنیان نظر آرہا تھا۔ نوجوان سلک کے گلوبند کو کچھ اس ڈھب سی گلے پر لپیٹے رکھتا تھا کہ اس کا سارا سینہ چھپا رہتا تھا۔ اس کے جسم پر میل کی تہیں بھی خوب چڑھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم سے کم پچھلے دو مہینے سے نہیں نہایا البتہ گردن خوب صاف تھی اور اس پر ہلکا ہلکا پوڈر لگا ہوا تھا۔ سوئٹر اور بنیان کے بعد پتلون کی باری آئی اور شہناز اور گل کی نظریں پھر بیک وقت اٹھیں۔

پتلون کو پیٹی کے بجائے ایک پرانی دھجی سے جو شاید کبھی نکٹائی ہوگی خوب کس کے باندھا گیا تھا۔ بٹن اور بکسوئے غائب تھے۔ دونوں گھٹنوں پر سے کپڑا مسک گیا تھا اور کئی جگہ کھونچیں بھی لگی تھیں۔ مگر چونکہ یہ حصے اوورکوٹ کے نیچے رہتے تھے۔ اس لیے لوگوں کی ان پر نظر نہیں پڑتی تھی۔

اب بوٹ اور جرابوں کی باری آئی اور ایک مرتبہ پھر مس شہناز اور مس گل کی آنکھیں چار ہوگئیں۔

بوٹ تو پرانے ہونے کے باوجود خوب چمک رہے تھے۔ مگر ایک پاؤں کی جراب دوسرے پاؤں کی جراب سے بالکل مختلف تھی۔ پھر دونوں جرابیں پھٹی ہوئی بھی تھیں۔ اس قدر کہ ان میں سے نوجوان کی میلی میلی ایڑیاں نظر آرہی تھیں۔

بلاشبہ اس وقت تک وہ دم توڑ چکا تھا۔ اس کا جسم سنگ مرمر کی میز پر بے جان پڑا تھا۔ اس کا چہرہ جو پہلے چھت کی سمت تھا۔ کپڑے اتارنے میں دیوار کی طرف مڑ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جسم اور اس کے ساتھ روح کی اس برہنگی نے اسے خجل کردیا ہے اور وہ اپنے ہم جنسوں سے آنکھیں چرا رہا ہے۔

اس کے اوور کوٹ کی مختلف جیبوں سے جو چیزیں برآمد ہوئیں وہ یہ تھیں :

ایک چھوٹی سی سیاہ کنگھی۔ ایک رومال، ساڑھے چھ آنے، ایک بجھا ہوا آدھا سگریٹ، ایک چھوٹی سی ڈائری جس میں لوگوں کے نام اور پتے لکھے تھے۔ نئے گراموفون ریکارڈوں کی ایک ماہانہ فہرست اور کچھ اشتہار و مٹرگشت کے دوران میں اشتہار بانٹنے والوں نے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے تھے اور اس نے انھیں اوور کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

افسوس کہ اس کی بید کی چھڑی جو حادثے کے دوران میں کہیں کھو گئی تھی اس فہرست میں شامل نہ تھی۔

الفاظ و معانی

بانکپن بچپن **چونچالی** ہوشیاری، چالاکی **یکبارگی** اچانک **منعطف** متوجہ ہونے والا **حرکات و سکنات** اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا **متانت** سنجیدگی **جاذبیت** کھینچنے کی طاقت **ورغلانا** بہکانہ **محظوظ** خوش، مسرور **استطاعت** قدرت، طاقت **وضع** شکل، حلیہ، رنگ ڈھنگ **قراقلی** ایک قسم کا کپڑا جس سے اوور کوٹ بنائے جاتے ہیں **مصفّا** صاف ستھرا **چیدہ چیدہ** عمدہ عمدہ، اچھے اچھے **ماہر تجربہ کار** **ملحوظ** لحاظ کیا گیا، خیال کیا گیا **استغنا** بے پروا **مٹرگشت** آوارہ گردی **آرکسٹرا** ایک طرح کا باجا **ناقدانہ** پرکھنے والی **چھچھلتی ہوئی** دوسری چیز کو چھو کر گزرتی ہوئی **چغہ** جبّہ **کلاہ** ٹوپی **گلوبند** گلے میں باندھنے کا اونی یا ریشمی پٹکا **جرّاحی** آپریشن **بید** ایک قسم کا درخت جس کی شاخیں لچکدار ہوتی ہیں **تعاقب** پیچھا کرنا **بگولے** ہوا کا چکر، گرد، باد **رمق** تھوڑی سی جان **دھجی** کپڑے یا کاغذ کا کترن **نکٹائی** مغربی وضع کی پٹی جو قمیص کے کالر میں لگائی جاتی ہے **جرابیں** موزے **خجل** شرمندہ

مشق

1. مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب دو۔ تین جملوں میں لکھیے :

(1) نوجوان کا اوور کوٹ پرانا ہونے کے باوجود قابلِ تعریف تھا۔ بتایئے۔

(2) ریستوران کے باہر کن لوگوں کا ہجوم تھا؟ وہ لوگ خاموش کیوں کھڑے تھے؟

(3) نوجوان نے انگریزی موسیقی کی دکان میں کن کن چیزوں پر سرسری اور ناقدانہ نظر ڈالی؟ اس نے کارندہ سے کیا مانگا؟

(4) نوجوان کی موت کس طرح واقع ہوئی؟

(5) نوجوان کے اوور کوٹ کی جیب سے کون کون سی چیزیں دستیاب ہوئیں؟

(6) مصنف نے اس کہانی میں نوجوان کی زندگی کی کس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے؟

2. مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے لکھیے :

(1) سمینٹ کی بینچ پر بیٹھے نوجوان کی نظر سے جو مناظر گزرے، کسی ایک کے بارے میں اپنے الفاظ میں لکھیے۔

(2) مٹرگشت کے دوران جتنی انسانی شکلیں نوجوان نے دیکھی تھیں ان میں جن شکلوں نے اس کے دل کو موہ لیا تھا اسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔

3. وجہ بیان کیجیے :

(1) نوجوان نے لارنس گارڈن کی طرف جانے والی سڑک کا رُخ نہیں کیا۔

(2) کچھ کم نصیب لوگ دور کھڑے تفریح گاہوں اور دکانوں کی رنگا رنگ روشنیوں سے جی بہلا رہے تھے۔

(3) قالین کی قیمت سُن کر نوجوان نے اپنی بھنوؤں کو سُکیڑا۔

(4) مال روڈ پر نوجوان کچھ لمحے رُک گیا۔

4. مندرجہ ذیل الفاظ کی ترکیب سمجھایئے :

با رونق، ناخوشگوار، جستجو، خوشبودار، راہ گیر

5. جملے بنایئے :

تانتا بندھنا، متوجہ ہونا، کانوں کان خبر نہ ہونا، دل موہ لینا، آنکھیں چار ہونا

6. مندرجۂ ذیل جملوں میں جو علامتیں استعمال ہوئی ہیں انہیں الگ کرکے ان کے نام لکھیے :

(1) مال روڈ پر موٹروں، تانگوں اور بائیسکلوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔

(2) ''ذرا ایرانی قالین دیکھنا چاہتا ہوں۔ اتاریئے نہیں یہیں دیکھ لوں گا۔ کیا قیمت ہے اس کی؟''

(3) لڑکی اچانک چمک کر بولی : ''ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔''

(4) اس نے مجھ سے کہا۔''یہ آخری شو تھا میرے دوست! یہ ریل کے ڈبّے کل واپس ہوجائیں گے۔''

●

13 آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گلچیں کی تلاش میں

پنڈت دیا شنکر نسیمؔ

پیدائش 1811ء وفات 1843ء لکھنؤ

دیا شنکر نام اور نسیمؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کا خاندان کشمیر سے آکر لکھنؤ آباد ہوگیا تھا۔ یہیں ان کی ولادت ہوئی۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور شاہی فوج میں وکالت کرنے لگے۔ نسیمؔ بڑے خوش مزاج اور وضعدار انسان تھے۔ کم عمری ہی سے شعرائے اردو کا کلام ان کے مطالعے میں رہا۔ نتیجتاً شعر کہنے لگے اور آتش کے شاگرد ہوئے۔

نسیمؔ نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ ان کی شہرت کی بنیاد مثنوی گلزارِ نسیمؔ پر ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے گلِ بکاؤلی کا مشہور قصہ نظم کیا ہے۔ اختصار، معنی آفرینی، نازک خیالی، محاورہ بندی اور رعایت لفظی اس مثنوی کی امتیازی خصوصیات ہے۔

گل کا جو الم چمن چمن ہے
یوں بلبلِ خامہ نعرہ زن ہے

گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا
اور غنچۂ صبح کھل کھلایا

وہ سبزۂ باغ خواب آرام
یعنی وہ بکاؤلی گُل اندام

جاگی مُرغ سحر کے غُل سے
اُٹھی نکہت سی فرشِ گل سے

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پُر آب وہ چشم حوض پائی

دیکھا تو وہ گل ہَوا ہُوا ہے
کچھ اور ہی گُل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گُل
جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل

ہے ہے مِرا پھول لے گیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بُو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے

نرگس تو دکھا کدھر گیا گل
سوسن تو بتا کدھر گیا گُل

سنبل مِرا تازیانہ لانا
شمشاد انھیں سُولی پر چڑھانا

تھرّائیں خواصیں صورتِ بید
ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

نرگس نے نگاہ بازیاں کیں
سوسن نے زباں درازیاں کیں

پتّا بھی پتے کو جب نہ پایا
کہنے لگیں کیا ہوا خُدایا

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون
بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون

شبنم کے سوا چرانے والا
تھا اوپری کون آنے والا

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہوجائے
جس گھر میں ہو گُل چراغ ہوجائے

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس
غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس

آنکھوں سے عزیز گُل مِرا تھا
پُتلی وہی چشم حوض کا تھا

نام اس کا صبا نہ لیتی تھی میں
اس گُل کو ہوا نہ دیتی تھی میں

گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا
غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

او خار پڑا نہ تیرا چنگل
مشکیں کَس لیں نہ تو نے سُنبل

اور بادِ صَبا ہَوا نہ بتلا
خوشبو ہی سنگھا پتہ نہ بتلا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے
گُل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کُہرام
تھی سبزے سے راست مو بر اندام

انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد
تھا دم بخود اس کی سُن کے فریاد

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا
جو برگ تھا ہاتھ مَل رہا تھا

رنگ اس کا غرض لگا بدلنے
گُلبرگ سے کف لگی وہ مَلنے

بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی
دست آویز اس کے ہاتھ آئی

خاتم تھی نام کی نشانی
انسان کی دست بُرد جانی

ہاتھوں کو ملا کہا کہ ہیہات
خاتم بھی بدل گیا ہے بد ذات

جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا
وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا

عریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے
کھال اس کی جو کھینچئے سزا ہے

یہ کہہ کے جنوں میں ہو غضبناک
خوں روئی لباس کو کیا چاک

گُل کا سا لہو بھرا گریباں
سبزے کا سا تار تار داماں

دکھلا کے کہا سمن پری کو
اب چین کہاں بکاؤلی کو

تھی بسکہ غبار سے بھری وہ
آندھی سی اٹھی ہوا ہوئی وہ

کہتی تھی پری کہ اُڑ کے جاتی
گلچیں کا کہیں پتہ لگاتی

ہر باغ میں پھولتی پھری وہ
ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ

جس تختے میں مثلِ باد جاتی
اس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے؟
پتّا نہیں حکم بن ہلا ہے

الفاظ و معانی

جُل دھوکا، چَھل **نرگس** ایک پھول، شاعر جسے آنکھ سے تشبیہہ دیتے ہیں **سوسن** آسمانی رنگ کا پھول جسے زبان سے تشبیہہ دیتے ہیں **شمشاد** ایک لمبا خوبصورت درخت **کہرام** رونا، واویلا **ہوا ہونا** فنا ہونا **ہوا دینا** اُکسانا، بھڑکانا **ہوا نہ لگنے دینا** ذرا سا بھی اثر نہ ہونے دینا **گُل کھلانا** کوئی انوکھا کام کرنا **ہاتھ پڑنا** مفت ہاتھ آنا **ہاتھ لگنا** حاصل ہونا **چراغ گل ہونا** چراغ بجھنا، اندھیرا چھانا، برباد ہونا **چنگُل پڑنا** جنگل مارنا، پنجہ مارنا **نخل** کھجور کا درخت، **دستاویز** سند، ثبوت **خاتم** انگوٹھی، مہر، چھاپ **جنوں** پاگل پن، دُھن **طیش** غضب ناک، غصے میں بھرا ہوا، خفا

مشق

.1 مندرجہ ذیل سوالات کے جواب لکھیے :

(1) گل کے غائب ہونے پر بکاوَلی کی کیا کیفیت ہوئی؟

(2) پُر آب وہ چشم حوض پائی سے کیا مراد ہے؟

(3) گل کے غائب ہونے پر بکاوَلی نے کن کن لوگوں سے دریافت کیا؟

(4) بکاوَلی کو شبنم پر کیوں شک ہوا؟

(5) گلچین کا سُراغ کیسے ہاتھ آیا؟

.2 سمجھایئے :

(1) نرگس نے نگاہ بازیاں کیں
سوسن نے زباں درازیاں کیں

(2) آنکھوں سے عزیز گُل مِرا تھا
پُتلی وہی چشم حوض کا تھا

(3) تھی بسکہ غبار سے بھری وہ
آندھی سی اٹھی ہوا ہوئی وہ

.3 مثنوی میں استعمال کیے گئے محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

●

14 جب آنکھیں آہن پوش

عزیز احمد

پیدائش : 1913ء وفات : 1982ء

عزیز احمد 1913ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ یہاں سے انہوں نے 1924ء میں بی۔ اے آنرس کیا۔ انہوں نے اپنا مضمون انگریزی رکھا تھا۔ 1938ء میں عثمانیہ یونیورسٹی ہی میں انگریزی کے پروفیسر ہوئے۔ 1942ء میں نظام حیدرآباد کی بہودر شیوار کے اتالیق مقرر ہوئے اور چار سال شاہی خانوادے سے منسلک رہے۔ اس کے بعد پھر وہ یونیورسٹی آ گئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے اور حکومت پاکستان میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

عزیز احمد نے اپنی زندگی کا آغاز جامعہ عثمانیہ کے زمانے سے کیا۔ اپنے ابتدائی زمانے میں حیدرآباد قیام کے دوران ترقی پسند ادب کے نام سے اپنی یادگار تصنیف لکھی۔ جس میں ترقی پسند ادب کا تعارف پیش کیا۔

'اقبال ایک نئی تشکیل' جس میں انہوں نے اقبال کی، شعریات کی، ازسرِ نو مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ کئی ناول لکھے۔ جس میں 'ایسی بلندی ایسی پستی' ناول حیدرآباد کی تہذیبی پس منظر میں لکھا گیا، جو بہترین ناول میں شمار ہوتا ہے۔ عزیز احمد نے انگریزی میں بھی لکھا ہے۔ اسٹڈیز اینڈ اسلامک کلچر اِن اینڈین انوائرمنٹ کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

[وہ جو آج خاک کے نیچے دبی ہوئی ہمیشہ کے لیے سو رہی ہے اس زمانے میں جوان تھی، زندہ تھی، اور خوبصورت تھی۔ اس کا گداز جسم زندگی اور قہقہوں سے مالا مال تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اذیت اسے خاموش نہیں کرسکتی، اس کی ہنسی نہیں روک سکتی کبھی کبھی وہ سوچ میں پڑ جاتی اور خاموش ہوجاتی، مگر جب وہ تیمور کو اپنے سے زیادہ خاموش پاتی تو ایک نئی زندگی کی لہر قہقہہ بن کر اسے زندہ کرجاتی]

(اور جب اولجائی قبر میں اتاری گئی ہے تو تیمور دور تھا) لیکن اس نے وہ دن یاد کیا۔ جب اس نے اپنے ہاتھوں قبر جیسے کنوئیں میں اتارا تھا۔ چغتائی شہسواروں سے بچانے کے لیے۔

لال لال سنگلاخ چٹانیں۔ دور دور تک ہوا ریت کے لال لال دروں سے سرخ۔ جیسے لاکھوں چیونٹیاں ہوا میں منتشر ہوں جیسے فضا میں روز نشور کی سی گرمی اور سرخی ہو۔ اینٹوں کی بھٹی کی گرمی۔ لیکن اس گرمی کے باوجود اس سال چغتائی شہسوار خان تینگری کے ٹھنڈے ٹھنڈے صنوبروں کے سائے میں واپس نہیں گئے تھے۔ الیاس اور بکی جوک کے شہسوار ایسک کول کے کنارے کی ٹخنوں ٹخنوں اونچی گھانس میں گھوڑے نہیں چرا رہے تھے ان کے گھوڑے اب بھی ماوراءالنہر کے مغرب میں تپتے ہوئے ریگستانوں میں دشمنوں کو تلاش کر رہے تھے، خود اس کو اور سلطان حسین کو۔ ان گھوڑوں کی لگاموں سے کھینچی ہوئی گردنیں بحیرۂ خوارزم اور بحیرۂ خرد کے کڑوے کھارے مواج پانی کو دیکھتیں، بیزاری اور پیاس سے ہنہنانے کی آواز آتی، اور لگامیں پھر مشرق کی طرف مڑ جاتیں۔

جہاں جہاں کسی زرد رُو کی گھانس کے چرا گاہ میں، یا کسی چشمے کے کنارے، یا کسی دریا کی وادی میں چغتائیوں کے

ہاتھوں ستائے ہوئے ترکمان چرواہے ملتے تیمور سے یہی کہتے ''یا خواجہ، یا امیر ادھر خطرہ ہے۔'' اور ترکمان چرواہیاں اپنی پتلی پتلی لمبی لمبی آنکھوں سے گھور گھور کے اولجائی تُرکان آغا کو دیکھتیں اور پھر اولجائی ترکان آغا کی مسکراہٹ وبا کی طرح سب میں پھیل جاتی۔

ایک لاغر سا گھوڑا تھا، جو علی بیگ نے کھٹملوں اور گوبر کے کیڑوں والے اصطبل سے چلتے وقت دیا تھا اس پر تیمور سوار تھا، اور ایک اونٹ تھا جس کی کھال جابجا لٹک رہی تھی اور خارش سے جسم پر کیڑوں کے تکّے جمع ہوئے تھے۔ اس پر اولجائی سوار تھی۔

لال لال سنگلاخ چٹانی اور ہوا میں ریت کی لالی۔ قزل قم کی بے حد و انتہا سرخی اور سرخی میں معجزے کہیں کھارے پانی کے چشمے، جن کو دیکھ کر گھوڑا ہنہنا کر پسینے سے شرابور گردن پھیر لیتا اور رونگٹوں کی طرح اس کے ایال کے بال کھڑے ہوجاتے اور اونٹ بے بسی سے بلبلا کے دوسری طرف دیکھنے لگتا اور کہیں کہیں معجزہ کے طور پر میٹھے پانی کا ایک کنواں۔

اس کے کنوئیں کا اس ماحول سے کوئی تعلق نہ تھا، دور دور تک کہیں سبزی کا کوئی پتہ نہ تھا، اس کا امکان کم تھا کہ دشمن کے سوار یہاں تک آئیں۔ یہ ایک معجزہ ان سنگلاخ چٹانوں کے درمیان تہ بہ تہ، ان کراری چٹانوں کو کاٹ کر کسی زمانے میں کسی نے انسانوں کے لیے یہ کنواں کھودا ہوگا۔ اب کئی کئی فرسخ تک کوئی آبادی نہ تھی۔ ترکمانوں تک کے خیمے کہیں نظر نہ آتے تھے، لیکن تیمور کو معلوم ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں یہاں سے قریب ہی دریا بہتا تھا۔ جو سیحوں کے پانی کو جیون کے پانی سے ملاتا تھا۔ یہاں آبادی تھی۔ لوگ رہتے تھے۔ جو وحشی قبیلوں، مغلوں اور ریگستان کی نذر ہوگئے۔ جن کو مٹ کے صدیاں گذر گئیں اور اس کنوئیں کے کنارے چار جانداروں نے رات گذاری۔ تیمور نے اولجائی تُرکان آغا نے، لاغر گھوڑے اور خارش زدہ اونٹ نے، اور جب رات اندھیری تھی تو تیمور نے کہا۔ ''شکرم۔''

اولجائی ترکان آغا کی آنکھیں گرم گرم نیند سے بند ہوئی جاتی تھیں۔ اس نے سوتے جاگتے میں کہا ''ہوں۔''

بستر کے نیچے ریت سخت اور تکلیف دہ تھی۔ تیمور نے کہا ''شکرم۔ اس طرح تو قزل قم کا یہ ریگستان ہمیں کھا جائے گا۔ ہماری ہڈیاں تک یہاں بھوک اور پیاس سے سفید ہوجائیں گی اور کسی کو خبر نہ ہوگی اور اس ریگستان میں بھی چغتائی ہر جگہ ہمارا پیچھا کررہے ہیں۔''

اولجائی نے ہنس کر کہا۔ ''اچھا اب سوجاؤ۔ صبح کو اٹھ کے سوچیں گے، رات کو نیند نہ آئے گی تو صبح کو بادیہ میں سفر کرنے کی طاقت کہاں سے آئے گی۔''

تیمور نے کہا۔ ''شکرم۔ میں سوچ رہا تھا کہ کچھ کرنا چاہیے۔ اس ریگستان سے نکلنا چاہیے۔ اگر میرے پاس صرف چند رفیق اور ہوتے۔ اگر میں اس قدر تیز سفر کرسکتا کہ ان رفیقوں کو پاسکتا جو خوارزم کے قریب کے دیہاتوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ جیسے امیر سیف الدین جس کے ساتھ ہمارا جہانگیر ہے اور آق بوغا اور ایلچی بہادر اور جاکر برلاس ہے۔ یہ اگر میرے ساتھ ہوتے یا میں ان کے پاس پہنچ سکتا یا میں انھیں پاسکتا۔ میں اتنا تیز سفر کرسکتا یا اکیلا سفر کرسکتا۔''

اولجائی چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اوپر نیلگوں آسمان تھا جس سے دن کی اڑی ہوئی سرخ خاک کے ذرے آہستہ آہستہ غیر مرئ

طور پر برس رہے تھے۔ ان سے اوپر چمکتے ہوئے ستارے تھے، کہکشاں، اور لال تارے اور سنہرے ستارے اور ایک سبزی مائل تارہ اور نیچے دور دور تک لال لال چٹانیں اور ریت کو ہڈیوں اور پسلیوں جیسی شکنیں تھیں۔

اس جلائر شاہزادی نے اس سنگلاخ زمین اور اس دور دراز آسمان کی طرف دیکھا اور چشم زدن میں فیصلہ کرلیا۔ اس نے تیمور کے دونوں ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں دبوچ لیے اور کہا۔ ''اچھا آپ اکیلے جایئے اور انھیں ڈھونڈیئے۔''

''اولجائی۔ اولجائی۔ میں تجھے اس ریگستان میں تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں......''

اولجائی نے جواب دیئے بغیر ایک سوال کیا۔ ''یہ بتاؤ تمہیں یہاں واپس آنے میں کتنے دن لگیں گے؟''

''اگر زندہ رہا تو دو ہفتے۔'' تیمور نے کہا۔ اور اب وہ بھی اٹھ بیٹھا۔

اولجائی نے اس کے چوڑے مضبوط شانے پر سر رکھا، اور اپنے زار و قطار اڑے ہوئے آنسو روکے اور کہا۔ ''تیمور مجھے اس نیلگو آسمان سے ڈر نہیں لگتا، جسے مغل پوجتے ہیں۔ مجھے اس سنگلاخ زمین سے ڈر نہیں لگتا جس پر کوسوں تک ایک سبز پتا نہیں۔ لیکن اگر تیرے جانے کے بعد چغتائی یہاں آپہونچے اور میرا وہی حشر ہوگا جو چنگیز کی بیوی بورتے ٹی کا ہوا تو میں تیرے پاس کبھی واپس نہیں آؤں گی : اپنی جان دے دوں گی۔''

تیمور کی داڑھی کے کالے گھنے بال، اس کی دو ہری زلفوں میں الجھ رہے تھے۔ تیمور نے اس کے رخساروں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''اولجائی میں تجھ سے ہمیشہ کہتا آیا ہوں کہ راویوں سے فضول داستانیں نہ سنا کر۔ میں تجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ زندہ رہیں گے تو دونوں زندہ رہیں اور اگر قسمت میں ہوگا تو رفیق مل ہی جائیں گے۔''

اولجائی نے اس کے ہاتھوں کو اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں سے لگایا۔ ''تجھ پر سے میری ایسی ہزار جانیں قربان' مجھے اس کنوئیں میں اتار دے۔ اگر دشمن کے سپاہی آئیں گے بھی تو میں چٹانوں کے نیچے چھپ جاؤں گی اور اوپر سے ڈول ڈال کر پانی لے جائیں گے۔ لیکن اس طرف شاید ہی کسی کا گذر ہو۔ لیکن اپنا وعدہ یاد رکھو اور پندرہ دن بعد آ کے مجھے لے جائیو۔''

اولجائی ذرا ہٹ کے بیٹھ گئی اور استقلال سے اس نے کہا۔ ''کیسے نہیں ہوسکتا یہی تقدیر ہے اور یہ ہوکر رہے گا۔ مگر پندرھویں دن آجانا۔''

دوسری صبح کو تیمور نے دور لے جاکر خارش زدہ اونٹ کو ذبح کیا اور اس کا کچھ گوشت اولجائی کے ساتھ کنویں میں اتارا۔ آگ جلانے کے لیے گھوڑے کے کھانے کی سوکھی ہوئی گھانس دی۔ اس آوارہ گردی کے زمانے میں آدھا کچا اور آدھا پکّا گوشت کھانے کی ان دونوں کو عادت ہوگئی تھی۔ اپنے لیے ایک روٹی رکھی اور باقی ساری روٹیاں اولجائی کے لیے کنوئیں میں اتار دیں۔ آگ چلانے کے لیے چقماق کے پتھر دیے۔ ایندھن کے لیے اونٹ کا محمل دیا اور پھر کنوئیں کے کنارے سے اسے جھانک کے دیکھا۔ پانی تہہ میں آئینہ کی طرح چمک رہا تھا اور کنارے کی چٹان پر جس کا رنگ پانی کی ریت سے سرمئی ہورہا تھا۔ اولجائی کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اس کا چہرہ تمتا رہتا تھا، اور دونوں چوٹیاں سینے پر گندھی ہوئی پڑی تھیں، اس کی آنکھیں خشک تھیں اور ایک بے پایاں محبت اور قربانی کی چمک سے جگمگا رہی تھیں اور اس کے ہونٹوں پر امید اور بے بسی کی وہ مسکراہٹ تھی جس نے سخت سے سخت مصیبت میں بھی تیمور کا دھیان بٹائے رکھا۔

''اولجائی فی امان اللہ۔''

''فی امان اللہ۔ آج سے پندرھویں دن۔'' اولجائی کی آواز در صدائے بازگشت کنوئیں میں گونج گئی۔

''پندرھویں روز۔''

اور پندرھویں دن جب واپس آیا، اپنے بیٹے جہانگیر کے ساتھ اور سیف الدین، اور جاکوبرلاس، اور آق بوغا، اور ...... قاضی زین الدین کے ساتھ اور اس نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا ...... تو وہ جو کنوئیں میں اتاری گئی تھی، چونکی تک نہیں۔ اس نے گردن اٹھا کے یہ معلوم کرنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ گھوڑوں کی ٹاپ دشمنوں کے راہواروں کی تھی یا تیمور کی۔ ان دو ہفتوں میں اس کنوئیں کی زندگی نے اسے عارضی طور پر اندر سے تسخیر کرلیا تھا، یہاں سے آسمان کا صرف ایک حصہ نظر آتا تھا، وہی حصہ جسے کنوئیں کے منھ نے معین کیا تھا، اور دو ہفتہ تک شب بہ شب ساعت بہ ساعت وہی ستارے اسی جگہ نظر آتے تھے۔ دن کو پرچھائیں، اسی جگہ پڑتی اسی جگہ کھسکتی اور شام کے اژدہے جیسے دھندلکے میں جذب ہوجاتی اسے یہ محسوس ہوا تھا کہ قبر بھی ایسی ہی کوئی جگہ ہوگی۔ جو زمین سے زیادہ نیچے ہے۔ جہاں کوئی ساتھی کوئی رفیق نہیں۔ یہاں راتوں کو آسمان پر ستارے بھی نہیں چمکتے۔ صرف انسان ہوتا ہے اور اس کا خدا۔

اور وہ کیفیت جو سالہا سال کی ریاضت سے پیدا ہوتی ہے، ساعت بہ ساعت اولجائی ترکان آغا کے دل میں پیدا ہوتی گئی۔ یہ کہ یہ سب ہیچ ہے۔ یہ زمین یہ آسمان۔ یہ زندگی۔ دشت بہ دشت، قریہ بہ قریہ۔ کوبکو۔ یہ کہ وہ خود ہے، جب تک زندہ ہے، ہے اور اس کے سوا صرف خدا ہے، جو ہر جگہ ہے۔ اقی جو کچھ ہے غول بیابانی ہے۔ ریگستان کے غیر مرئی جن اور عفریت میں خواہ وہ سپاہی ہوں۔ دوست ہوں یا دشمن ہوں، خون کے پیاسے ہوں یا چاہنے والے ہوں۔ سب کے سب لاحول کے مستحق ہیں۔ ان تمام صحرائی آسیبوں، ان غول بیابانی کے خوف کو اس نے سب سے بڑے خوف کے سپرد کردیا۔ اس کا خوف جس کا بنایا ہوا نیلگوں آسمان تھا، جہاں اکیلی راتوں میں تاروں کی قندیلیں جلتی تھیں، جس کا بنایا ہوا اس کنوئیں کا ٹھنڈا پانی تھا جسے اس سرخ ریگستان کی گرم ہوا خشک نہیں کرسکتی تھی اور یہ خوف ایک طرح کی محبت بھی تھی۔ جیسے تیمور سے اس کے رشتہ میں محبت اور خوف دونوں منسلک تھے۔

اس کنویں میں جب دوسرا دن گذرا، اور دوسری رات ہوئی تو رات کو اس کوہ کے دامن میں جو رحمت بھی تھا، جو سہارا بھی تھا اولجائی نے پناہ لی۔ اس نے جب وضو کیا، تب بھی اسے شک تھا کہ یہ محض رسمی عبادت ہے یا کچھ اور بھی ہے، لیکن جب اس نے عشا کی نیت باندھی تو اس اندھیری اکیلی رات میں، اس سنسان صحرا، اس سنسان آسمان میں اس کے اور کسی اور کے درمیان ایک ایسا رشتہ بندھ گیا جو ہر طرح کی رسمی عبادت سے بالا تھا۔ اسے یاد نہیں رہا کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں، کتنی دیر تک قرآن کی آیتیں پڑھتی رہی اور کون کون سی آیتیں پڑھتی رہی، وظیفہ میں کیا کیا پڑھا اور کیوں پڑھا اور اس حالت میں کب سوگئی۔

تیسرے دن جب وہ سو کر اٹھی تو آفتاب اس کنویں پر اس طرح طلوع ہوا جیسے گھر کے صحن میں، جیسے خانہ باغ کی روِش پر طلوع ہوتا ہے۔ اب اس دشت، اس بادیہ، اس گرمی، اس تنہائی، اس زمین، اس آسمان سے اس کی صلح ہوچکی تھی۔ کوئی اور اس کے ساتھ۔ وہ جو ہر جاندار سے زیادہ جاندار تھا۔ اس نے سڑے ہوئے اونٹ کے گوشت کو دور پھینک دیا اور کنویں کے ٹھنڈے

پانی میں بھگوکے سوکھی روٹی کا ٹکڑا کھایا اور پھر کنویں کی دیوار کی چھاؤں میں اس بے وقت کی نماز کی نیت باندھی، اور ساری دنیا سے غافل ہوگئی اور اسی طرح دن گذرتے گئے، سوکھی روٹیاں کم ہوتی گئیں۔ وہ کمزور ہوتی گئی۔ پندرھویں دن جب تیمور نے کنویں کے سرے پر آ کے آواز لگائی۔ 'اولجائی اولجائی۔ اولجائی۔'' تو اس نے گردن تک نہیں اٹھائی لیکن جب تیمور کے قریب سے جہانگیر نے اسے پکارا ''انا۔ انا'' تو وہ چونک پڑی۔ گویا وہ کڑی جو ان دو ہفتوں میں اس دنیا سے، اس تنہائی میں ٹوٹی تھی، پھر جُڑ گئی۔ وہ ماں بن گئی ایک خالقانہ جذبہ تھا جو بیدار ہوا، اور اس نے سر اٹھاکے اوپر دیکھنا چاہا کہ کنویں کی دیواریں، اور محدود آسمان کی حدود اربعہ دست و گریباں ہوکے گھوم گیا، اور وہ بیہوش ہوگئی۔

''بیٹی ایسا ہوتا ہے۔'' بابا زین الدین نے کہا۔''کبھی کبھی ایسی جھلک دکھائی دے جاتی ہے کبھی سر راہے فقیر کو وہ نعمت عطا ہوجاتی ہے جو زاہد کو عمر بھر کی ریاضت میں نہیں ملتی۔ کیونکہ جہاں امتحان ہے وہاں زحمت ہے اور جہاں زحمت ہے وہاں اطمینان ہے۔ زندان چاہ بھی ایک مقام ہے، جس سے گذرنا ضروری ہے۔ کیونکہ جو اس سوئی کے ناکے سے ہوکر نہ گذرے، وہ قلب ضمیر سے محروم رہ جاتا ہے اور یہ نعمت ہر ایک کو میسر نہیں آتی۔''

اولجائی، سرجھکا کر سنتی رہی۔ پھر اس نے کہا : مگر بابا زین الدین میرا دل پھر اب پہلا سا ہوگیا۔ اب مجھے نماز میں حضور قلب میسر نہیں آتا۔ مجھے اب پھر اپنے بیٹے اور اپنے خاوند سے ویسی ہی محبت ہے، اس دن جب میں نے جہانگیر کی آواز سنی، جس نے مجھے ماں کہہ کے پکارا تو معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی خواب تھا جس سے میں یکلخت بیدار ہوئی، جیسے اصل حقیقت یہی دنیا تھی جس میں تیمور ہے، جہانگیر ہے، میں ہوں اور وہ دنیا ...... وہ محض کنویں کی دنیا تھی۔

زین الدین بابا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔''بیٹی یہ راز تیری سمجھ میں نہیں آئے گا، تجھے جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہی کام کر، اپنے شوہر کا خیال رکھ۔ اپنے بیٹے کی پرورش کر اور صرف یہ سمجھ لے کہ تو جہانگیر کو پالتی ہے جیسے تو نے اسے اس وقت پالا جب وہ تیرے پیٹ میں تھا، اسی طرح تجھے اس نے پالا اور اپنی ذات میں سمیٹ لیا جو اس کنوئیں کا مالک ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ اگر میں بتا سکتا ہوں تو یہ کہ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کنویں کے امتحان کے بعد تیرے اور تیمور کی زندگی کے دن بدل گئے۔ خاص طور پر تیمور کی زندگی کے ......''

''بابا زین الدین۔ کیا میری زندگی کے دن نہیں بدلیں گے؟''

''بدلیں گے ضرور بدلیں گے۔ لیکن تیمور کی زندگی کے دن بہت بدلیں گے کیونکہ چاہ کنعان اور زندانِ مصر دونوں کی صعوبت یوسف نے اٹھائی، لیکن یعقوب اور اسحاق کی جانشینی یوسف کے حصے میں نہیں آئی، یہودا کو ملی جو یوسف کے ان سوتیلے بھائیوں میں سے تھا جنھوں نے یوسف کو قید کیا تھا، اور یہودا عیاش تھا لیکن یوسف پاکدامن تھا۔

ہراساں ہوکے اولجائی نے کہا۔''بابا زین الدین میں نے آپ کی بات نہیں سمجھی۔ کیا آپ کا مطلب ہے۔ تیمور مجھے چھوڑ دے گا۔ یا تیمور دوسری شادی کرلے گا۔ میں نے کبھی اسے منع نہیں کیا لیکن اس نے آج تک کسی اور عورت کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھا۔''

بابا زین الدین نے ذرا بے صبری سے کہا ''اولجائی بیٹی۔ اور سب عورتوں کی طرح تیری عقل کچی ہے۔ یہ تو کنویں کا مالک

ہی بہتر جانتا ہے کہ تو تیمور کو پہلے چھوڑے گی یا تیمور تجھے پہلے چھوڑے گا۔ لیکن ایک بات جو تو شاید سمجھ لے یہ ہے کہ اس نے تیمور کو نہیں، تجھے چاہ میں اسیر کیا اور اس کا کوئی کام دانش اور مصلحت سے خالی نہیں۔ مگر ان باتوں کو اس خیال کو چھوڑ۔ یہ دنیا چار دن کی ہے۔ اپنے شوہر اور اپنے بچے کے ساتھ خوش رہ۔''

اولجائی کے جانے کے بعد زین الدین نے سوچنا شروع کیا۔ کڑیاں تھیں کہ جڑتی ہی چلی جاتی تھیں۔ حالانکہ ان کڑیوں کو جوڑنا گستاخی تھی بہت سے کنویں سچے ہوتے ہیں اور بہت سے جھوٹے۔ چاہ کنعان سچا کنواں تھا، اور چاہ بابل، چاہ نخشب جھوٹے کنویں تھے۔ آنکھ کا کنواں سچا ہے، اور نرگش کا جھوٹا۔ حالانکہ نرگس آنکھ سے زیادہ پُرانی ہے۔ آنکھ کے چشمے میں نظر کا موتی ہے اور نظر کے چشمے میں سراب ہی سراب ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کس چشمے کا پانی کھارا ہے اور کس کا میٹھا۔ یہ تو وہی جانتا ہے جس نے میٹھا اور کھارا پانی بنایا ہے۔

بابا زین الدین کو کاز غان کی اس نواسی، اس جلائر شہزادی پر رشک آرہا تھا جس کنویں میں وہ تھی، اس میں کیا شک ہے کہ وہ کنواں کھرا کنواں تھا۔ سچا کنواں تھا، یوسف کا نظر کا، امتحان کا، تزکیۂ نفس کا کنواں۔ وہ زندان جس سے رہائی ملتی ہے تو انعام نہیں ملتا۔ کیونکہ اس کا انعام اتنا زیادہ ہے کہ وہ اس دنیا میں دیا نہیں جاسکتا۔ یوسف کا انعام مصر کی حکومت نہیں تھی۔ اصل انعام تو وہ تھا جو یہودا کو ملا۔ دانش انسانی ہیچ در ہیچ ہے اور دانش برہانی ہی جانتی ہے کہ کیوں امتحان یوسف کا لیا جائے اور اس کا انعام یہودا کو ملے۔ کیوں اولجائی کنویں میں اتاری جائے اور تیمور کی قسمت کا ستارہ چمکے۔ اس مفروضے کا کوئی منطقی ثبوت نہ تھا، لیکن یہ بغیر منطق کے ظاہر اور ثابت تھا اور اس رات قاضی زین الدین نے تیمور سے کہا۔

''امیر! میں نے تم سے کہا تھا کہ تو غلوق خاں سے اور چغتائیوں سے صلح نہ کرنا کیونکہ چٹان سے دودھ نہیں نکل سکتا۔ لیکن تم نے میری بات نہ مانی۔ خیر جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ اب تمہیں سمر قند کی ان بیٹیوں کی قسم ہے جو مغلوں کے اصطبلوں میں بھیڑوں کا دودھ دوہتی ہیں اور راتوں کو ان کے ساتھ بیسواؤں کا گناہ کرنے پر مجبور ہیں کہ جاؤ اور چغتائیوں کا مقابلہ کرو۔ اب مجھے امید ہو رہی ہے کہ خدا تمہیں ظفر یاب کرے گا ......''

تیمور نے کہا۔ ''قاضی زین الدین۔ میرے پاس لشکر نہیں۔ فوج نہیں۔ دولت نہیں۔ صرف چند ساتھی ہیں جو میری اور اپنی جان کی حفاظت کرسکتے ہیں۔ لیکن چغتائیوں سے مقابلہ کرنے کا تو بہر حال میں نے اور سلطان حسین نے عہد ہی کر رکھا ہے۔ کیونکہ آپ کو میری فتح کی بشارت ہوئی ہے؟''

بابا زین الدین نے ارشاد کیا۔ ''امیر تیمور گورگاں میں صوفی نہیں۔ کیونکہ میں نے کبھی صوف نہیں پہنا۔ میں نے کچھ دن تک تمہارے والد تار گائی کا ویہ اور تکیہ سنبھالا تھا لیکن وہ روشنی جو باطن سے آتی ہے جو اندر سے روشن ہوتی ہے مجھے نصیب نہیں ہوئی کیونکہ جو راستہ میں نے شروع سے اختیار کیا وہ شریعت کا تھا طریقت کا نہیں تھا۔ میرا سوز و گداز اخلاق کی حد سے آگے نہیں بڑھ پایا۔ میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بشارت ہوئی ہے کیونکہ میں بشارت کا اہل نہیں جو زمین بنجر یا شور ہوتی ہے۔ اس پر سبزہ نہیں جم سکتا۔ نہیں مجھے ایسے ہی خیال ہوا۔ دنیا اور اہل دنیا، اور اہل دنیا کے دلوں کو دیکھتے دیکھتے مجھے خیال ہوا کہ بعض اشارے ایسے ہوتے ہیں، بعض نشانیاں ایسی ہوتی ہیں، جن سے آنے والی باتوں کی خبریں مل سکتی ہیں۔ اولجائی تُرکان آغا نے دریا

کے قریب چاہ میں جو ایک ہفتہ گذارا وہ ایک نشانی تھا اور دوسری نشانی یہ ہے کہ اس قید چاہ کا اصلی فائدہ تم کو پہنچے گا۔ امیر گورگاں یہ سب قیاس ہی قیاس ہے۔ اس سے زیادہ مجھ سے کچھ اور نہ پوچھنا۔ اس سے زیادہ میں خود اور کچھ نہیں جانتا۔''

الفاظ و معانی

گداز نرم **پیچ** کم **اذیت** تکلیف **مفروضہ** فرض کیا ہوا چغتائی چنگیز خاں کا بیٹا **ظفریاب** فاتح **شہسوار** گھوڑے سوار **سنگلاخ** پتھریلی **صوف** اون، ایک قسم پشمینے کا کپڑا **روز نشور** قیامت **شرابور** تربتر، بہت بھیگا ہوا **قیاس** اندازہ **فرسخ** تین میل کا فاصلہ **خارش** کھجلی **طریقت** صوفیوں کا طریقہ جس سے روحانی کمال حاصل ہوتا ہے **ایندھن** جلانے کی چیز **محمل** اونٹ کا ہودہ **عارضی** وقتی **وبا** ایسی بیماری جو ہوا کے خراب ہونے سے پھیلتی ہے **معین** مقرر **ساعت بہ ساعت** لمحہ بہ لمحہ **دست بہ دست** ہاتھ بہ ہاتھ **معجزہ** وہ کام جو انسانی طاقت سے باہر ہو **قریہ بہ قریہ** گاؤں گاؤں **غول** مجمع **بیابان** ریگستان **تکّے** وہ تیر جس میں بھال نہ ہو **عفریت** بھیانک چیز **روش** طریقہ **خانقاہ** درویشوں کے رہنے کی جگہ **بادیہ** بڑا پیالہ **چاہ** کنواں **کنعان** فلسطین، جہاں حضرت یوسفؑ پیدا ہوئے تھے **زندان** قید خانہ **ہراساں** مایوس **نرگس** ریگستان میں کھِلنے والا پھول **تزکیۂ نفس** نفس کو پاک کرنا

مشق

1. ذیل کے سوالات کے مختصر جواب لکھیے :

(1) اولجائی نے دشمنوں سے پوشیدہ رہنے کے لیے کون سی جگہ تجویز کی؟

(2) کس کی آواز سے اولجائی بیدار ہوئی؟

(3) چاہ کنعان میں کس نے مصیبت اٹھائی تھی؟

(4) مصر کی جانشینی کسے سونپی گئی؟

(5) قاضی زین الدین نے کس وجہ سے تیمور کو تغلق اور چغتائیوں سے صلح نہ کرنے کی ہدایت دی؟

2. سوالات کے جواب لکھیے :

(1) ریگستان کا منظر بیان کیجیے۔

(2) تیمور ریگستان سے نکلنے کی کیا تدبیر سوچ رہا تھا؟

(3) تیمور نے اولجائی کو کنویں میں اتارنے سے پہلے کیا کیا انتظامات کیے؟

(4) اولجائی کا کنویں میں دوسرا روز کس طرح گذرا؟

(5) دو ہفتوں میں اولجائی نے کنویں میں کیا محسوس کیا؟

(6) کنویں میں اولجائی کی کیا حالت ہوئی؟

(7) زین الدین بابا نے اولجائی کو کیا ہدایت دی؟

.3 جملہ کون کس سے کہتا ہے لکھیے :

(1) زندہ رہیں گے تو دونوں زندہ رہیں گے۔

(2) کیا میری زندگی کے دن نہیں بدلیں گے۔

(3) اس کا کوئی کام دانش اور مصلحت سے خالی نہیں۔

(4) اچھا اب سو جاؤ صبح کو اٹھ کے سوچیں گے۔

.4 حرف عطف تلاش کیجیے :

(1) اگر قسمت میں ہوگا تو رفیق مل ہی جائیں گے۔

(2) اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔

(3) اندھیری راتوں میں تاروں کی قندیلیں چلتی تھیں۔

(4) بستر کے نیچے ریت سخت اور تکلیف دہ تھی۔

.5 جامع لفظ لکھیے :

(1) وہ علم جو عقلی دلائل سے حق اور ناحق میں تمیز کردیتا ہے۔

(2) صوفیوں کا طریقہ جس سے روحانی کمال حاصل ہوتا ہے۔

(3) وہ تیر جس میں بھال نہ ہو۔

(4) درویشوں کے رہنے کی جگہ۔

(5) ایسی بیماری جو ہوا کے خراب ہونے سے پھیلتی ہوں۔

.6 ہم معنی الفاظ کی ترتیب کیجیے :

معین	دانش
دوست	جگر
ہراساں	ویران
قلب	مایوس
عقل	رفیق
بیابان	مقرر
قیاس	طور
طریقہ	اندازہ

.7 محاورہ کا معنی بتا کر جملہ بنائیے :

دست و گریبا ہونا ہراساں ہونا شرابور ہونا

●

15 گیت

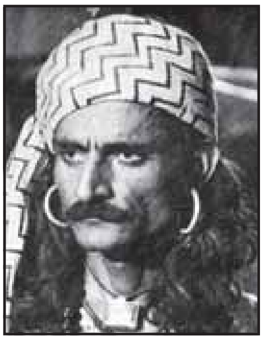

میرا جی

پیدائش : 1912ء   وفات : 1949ء   وطن : گوجرانوالہ

نام ثناء اللہ اور ادبی نام میرا جی ہے۔ میرا جی نام اختیار کرنے سے پہلے انھوں نے کئی نام اختیار کیے۔ مثلاً بندے حسین، بشیر چند بسنت سہائے وغیرہ

میرا جی باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کرسکے اپنی دیانت کی وجہ سے ذاتی مطالعے کی بنا پر زبان و ادب پر قدرت حاصل کی۔ میرا جی گوجرانوالہ سے لاہور چلے آئے اور ایک مدت تک ادبی دنیا سے منسلک رہے۔ لاہور سے دہلی آئے اور آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوئے۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بمبئی آ گئے تھے اور یہیں انتقال کیا۔

میرا جی جدید شاعری میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کے گیت واضح آسان دلچسپ اور رسیلے ہوتے ہیں۔ انھوں نے ہندو دیو مالا سے بہت فیض اٹھایا ہے۔ ہندی شاعری سے میرا جی کو بڑا لگاؤ تھا۔ مندرجہ ذیل گیت میں میرا جی نے دنیا کے اتار چڑھاؤ اور ان سے مقابلہ کرنے کی انسان کی طاقت اور دنیا کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کون ایسا بلوان جگت میں،
دُکھ کو اپنے بس میں کرلے، کون ایسا بلوان جگت میں
سب مُورکھ نادان
دل روئے صورت مُسکاتی
سمجھیں یونہی چمکے باتی
دل میں رہے گا دُکھ کا اجیالا، جلتی چتا سمان
گیانی جو بھی بات بتائے
اگیانی کو راس نہ آئے
دونوں سوچیں بھید کی اس کو کوئی نہیں پہچان
پل پل چھِن چھِن گنتا کیا ہے؟
تھاہ نہ پائی چِنتا کیا ہے؟
جو بیتے جیسے بھی بیتے، سمجھو ایک سمان
کس نے دیکھے اور کے سپنے
دکھ سکھ دونوں اپنے اپنے
یونہی اپنی بھوک مٹائے، جیون کا شمشان

کیسے کُھلا یہ رین جھرو کا کس نے کُنڈی کھولی
پھوٹ بھئی آکاش کی گنگا چاند نے صورت دھولی
پھول پہ اوس کی بوندیں دیکھیں
جیسے جگمگ جگنو چمکیں
ایسے لائی رات کی دیوی بھر کر اپنی جھولی
چھم چھم ناچتی کرنیں آئیں
ناچ ناچ میں گیت سنائیں
گیت کی دُھن ہے اَتی منوہر میٹھی گیت کی بولی
دن ڈوبا تو رات سجی ہے
چندا کی بارات سجی ہے
آگے آگے چندا ماموں پیچھے پیچھے ڈولی
تارے ہیں چندا کے ساتھی
ننھے ننھے یہ باراتی
سُکھ آنند سے جھوم کے ناچیں کھیلیں آنکھ مچولی

الفاظ و معانی

بلوان طاقتور **اجیالا** روشنی، چمک **تھاہ** بھید **سمان** یکساں

مشق

.1 مندرجہ ذیل سوالات کے جواب لکھیے :

(1) شاعر جگت میں سب بڑا بلوان کسے مانتے ہیں؟

(2) گیانی اور اگیانی ایک دوسرے سے اتفاق کیوں نہیں کرتے؟

(3) ہر انسان کا سُکھ اور دُکھ یکساں نہیں ہوتا یہ بات شاعر نے کس بند میں کہی ہے؟

.2 اس نظم کا خلاصہ لکھیے۔

●

16 نعت - جلوہ آرائی خیال کہاں

امین صدیقی

پیدائش : 1945ء

امین صدیقی مالیگاؤں جیسے مردم خیز خطہ میں 1954ء میں پیدا ہوئے۔ سخن سرائی کو اپنے خاندان سے وراثت میں پایا۔ مالیگاؤں کے ماحول نے پروان چڑھایا، دوستوں کی صحبتوں نے ایک کہنہ مشق باکمال استادِ فن کی حیثیت سے روشناس کرایا۔ جناب اطہرالخیری صاحب کی شاگردی اختیار کی۔ امین صدیقی کی تصنیفات میں "ماسن"، "تنزیل"، "ابلاغ" جیسے گراں قدر مجموعہ کلام ہیں۔ آپ طویل عرصے سے بستر علالت پر ہیں۔ لہٰذا بہت سا کلام ان کی تحویل میں ہو سکتا ہے۔ ابھی تازہ مجموعۂ کلام "برگ زبان" منظر عام پر آیا ہے۔ جو ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ ان کا تخلیقی سفر لگ بھگ پچاس برسوں پر محیط ہے۔ معاشرہ جن حالات و حوادث کی زد میں ہے ان کی شاعری اسی کے درد و کرب سے پیدا ہوتی ہے۔

ویسے تو امین صدیقی غزل کے استاد شاعر کہے جاتے ہیں لیکن انھوں نے چند اچھی حمد، نعت شریف اور منقبت میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مختلف اصناف سخن کی جلوہ گری شاعر کی دیدہ وری اور ہمہ جہتی فکر کی عمدہ مثال ہے۔ یہاں ان کی ایک نعت شریف پیش کی گئی ہے جس میں نئی تشبیہات اور اچھوتے انداز سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

اَے لالۂ صحرائی ہم تیرے تمنّائی
اطہر ہے، معطر ہے تو پیکرِ رعنائی
تیرے رخِ زیبا پر شبنم کے جو قطرے ہیں
آیات مقدّس ہیں پاکیزہ صحیفے ہیں
خوشبو سے تری مہکے ہاں خارِ مغیلاں بھی
تو ایک تبسم سے ناسور سے زخموں کی
کرتا ہے مسیحائی

تِتلی ترے پاکیزہ رس پی کے سنورتی ہے
بھونرے تیری عظمت پر جی جاں سے گزرتے ہیں
ہاں بادِ صبا تجھ کو جب چھو کے گزرتی ہے
گھلتی ہے فضاؤں میں اک نکہتِ یکتائی

تو صَحرا سرابوں میں چشمہ ہے حقیقت کا
تو شبؔ کی سیاہی میں ہے نور ہدایت کا
حیرت زدہ دنیا ہے اک تیرے توسّط سے
صحرا کے ببولوں نے مخمل کی رِدا پائی
جب وقت کی بانہوں میں کچھ شعلے بھڑکتے ہیں
جب دھوپ تمازت سے کچھ چہرے جھلستے ہیں
آنکھوں میں سماتا ہے تو بَن کے شکیبائی
اَے لالۂ صَحرائی
ہم تیرے تمنّائی

الفاظ و معانی

اطہر بہت پاک **معطر** خوشبودار **صحیفے** کتابیں **خار مغیلاں** ببول یا کیکر کا کانٹا **نکہت** پھول کی بو، خوشبو، مہک **سراب** ریتیلی زمین کی وہ چمک جس پر چاند سورج کی چمک سے پانی کا دھوکہ ہوتا ہے **وسط** درمیان، ذریعہ، وسیلہ **ردا** چادر، اوڑھنی **تمازت** گرمی **شکیبائی** صبر

مشق

.1 سوالوں کے جواب لکھیے :

(1) ''لالۂ صَحرائی'' کہہ کر کس کو مخاطب کیا ہے؟
(2) رُخ زیبا پر شبنم کے قطرے کیسے معلوم ہوتے ہیں؟
(3) ناسور سے زخموں کی مسیحائی کس طرح ہوتی ہے؟
(4) محبوب کے جلوؤں سے کون کون فیض یاب ہوتا ہے؟

.2 تشریح کیجیے :

تتلی ترے پاکیزہ رس پی کے سنورتی ہے
بھونرے تیری عظمت پر جی جاں سے گزرتے ہیں
تو صحرا سرابوں میں چشمہ ہے حقیقت کا
تو شب کی سیاہی میں ہے نور ہدایت کا

●

17	# گواہ

رشید احمد صدیقی

پیدائش : 1892ء وفات : 1977

رشید احمد صدیقی جونپور کے ایک قصبہ مڑیاہو میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا اور یہیں شعبۂ اردو سے وابستہ ہوگئے اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے اور آخر تک یہیں رہ کر تصنیف و تالیف کے کاموں میں مشغول رہے اور یہیں وفات پائی۔

''آشفتہ بیانی میری'' میں اپنی ابتدائی زندگی کے حالات بڑے دلچسپ انداز میں تحریر کیے ہیں اور ان کی اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں علی گڑھ سے کس قدر لگاؤ تھا۔ طنزیات و مضحکات کے نام سے اردو زبان میں طنز نگاری کی تاریخ بھی لکھی ہے۔

رشید احمد صدیقی اردو زبان و ادب کے بہترین طنز نگار اور ایک صاحبِ طرز انشاپرداز ہیں۔ ان کی تحریروں میں طنز و ظرافت کا جو انداز پایا جاتا ہے وہ نہایت صاف ستھرا اور بلند ہے زبان پر انہیں بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ مرقع نگاری میں بھی انہیں کمال حاصل کیا ہے۔ ''گنجہائے گراں مایہ'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' خاکوں کے مجموعے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں ''خنداں'' ''مضامینِ رشید'' اور ''جدید غزل'' یادگار ہیں۔

گواہ قربِ قیامت کی دلیل ہے۔ عدالت سے قیامت تک جس سے مفر نہیں وہ گواہ ہے۔ عدالت مختصر نمونۂ قیامت ہے اور قیامت وسیع پیمانہ پر نمونۂ عدالت۔ فرق یہ ہے کہ عدالت کے گواہ انسان ہوتے ہیں اور قیامت کے گواہ فرشتے جو ہمارے اعمال لکھتے ہیں اور خدا کی عبادت کرتے ہیں۔

عدالت کو قیامت اور قیامت کو عدالت کی جو حیثیت حاصل ہے، وہ گواہ کے دم سے ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے آرٹ کو عورت سے ہے، گواہ عینی ہو یا سماعی، روایتی ہو یا پیشہ ور ہر حال میں گواہ ہے اس لیے ہر حال میں خطرناک گواہ جھوٹا ہو یا سچّا عدالت کے لیے اس کا وجود اتنا ہی ضروری ہے جتنا برطانوی اقتدار کے لیے ہندوستان کی دولت اور ہندوستانیوں کی عبادت!

غالبؔ نے انسان کو محشر خیال قرار دیا ہے۔ ممکن ہے اس کے اسباب میں وہ گواہ بھی ہوں جن کے بیان پر غالبؔ کو اپنے عہد شاعری کا کچھ زمانہ جیل خانہ میں گزارنا پڑا تھا۔ گواہ کے تصور کے ساتھ ہمارے ذہن سے کتنے حالات و حوادث گزر جاتے ہیں۔ گاؤں، تھانہ، بے آبروئی، کچہری، جیل خانہ، جن کے مجموعے کا نام باغیوں نے ہندوستان اور وفا شعاروں نے حکومت رکھا ہے۔

اصول یہ رکھا گیا ہے کہ ہر انسان پیدائشی جھوٹا اور ہر گواہ اصولاً سچا واقعہ کچھ ہو جب تک کوئی گواہ نہ ہو اس کا عدم یا وجود یکساں ہے۔ باعتبار واقعہ ممکن ہے کسی حادثہ کا گواہ نہ ہو لیکن جس طرح فطرت خلا محض سے متنفّر ہے اسی طور پر ضابطہ فوجداری سے متعلق جتنے واقعات ہوسکتے ہیں ان کو بھی تنہائی محض سے بیر ہے، جس طرح ہر خلا کو پُر کرنے کے لیے ہوا یا اس کے بعض متعلّقات دوڑ پڑتے ہیں اسی طرح ہر موقع واردات پر پولیس اور اس کے گواہوں کا پہنچ جانا لازمی ہے، اکثر ایسا بھی ہوا ہے

کہ واردات سے پہلے گواہ پہنچ گئے، جیسے کبھی کبھی پولیس واردات کے بعد جائے وقوع پر پہنچنا بہتر سمجھتی ہے۔ قومی تنزّل کی مانند گواہ بھی ہر جگہ ملتا ہے۔ اگر قومی تنزل کے انکشاف کے لیے ایک لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے تو گواہ پیدا کرنے کے لیے کسی تھانے دار یا وکیل کا ہونا ضروری ہے۔

بعض مولوی وعظ کہنے سے پہلے ''کلوااوا شربوا'' کی خوش آئند توقعات کو پیش نظر رکھتے ہیں اسی طرح ایک تھانے دار یا وکیل کسی واقعہ یا حادثے کی تفتیش شروع کرنے سے پہلے گواہ کے ملنے یا نہ ملنے کے امکان پر غور کرتا ہے اور ان کے لیے گواہ پیدا کرلینا اکثر اتنا ہی آسان ہوتا ہے جتنا بعضوں کے لیے اولاد پیدا کرنا۔ اولاد کی پرورش یا نگہداشت کی مانند گواہ کا نباہ اور رکھ رکھاؤ بھی بڑا کٹھن کام ہے۔ کھانا، پینا، لباس، تعلیم و تربیت دونوں کے لیے لازمی ہے۔ حادثے کی اہمیت تمام تر گواہ پر منحصر ہے۔ ایک گواہ قتل عمد کو حفاظت خود اختیاری میں اسی آسانی سے تبدیل کرا سکتا ہے جس طرح کوئی تنقید نگار بے حیائی کو آرٹ میں ضرورت اس کی ہے کہ مدعی ذی حیثیت ہو اور حاکم عدالت خطابات کا متمنی اور نو روز یا ملک معظم کی سال گرہ کا منتظر۔

پہلی عالمی جنگ میں دولِ متحارب کا مقولہ تھا کہ آدمی اور سامان جنگ فراہم کردو ہم دشمن کی دھجیاں بکھیر دیں گے۔ جیسے یہ کوئی بہت بڑا راز تھا جس کا انکشاف کیا گیا تھا۔ ان کے پیش رو ایک بزرگ ارشمیدس نامی گزرے ہیں ان کا کہنا یہ تھا کہ فلکرم مل جائے تو میں زمین کا تختہ الٹ دوں۔ لیکن ان دونوں کے مقسوم علیہ اعظم پولیس والوں کا دعویٰ ہے کہ گواہ فراہم کردو تو ہندوستان میں نہ ہم کو کین فروش رہنے دیں گے نہ نان کوآپریٹر ہر بلندی پر یونین جیک ہوگا اور ہر پستی پر سلام علیک!

کسی بات کے حسن و قبح کا مدار زیادہ تر اِسی عہد کے ارباب اقتدار کی پسند یا نا پسند پر ہوتا ہے۔ بادشاہ کی مانند مقتدر شخص کسی غلطی کا مرتکب نہیں ہوسکتا، شاید اس لیے کہ اس پر جرم ثابت کرنے کے لیے گواہ نہیں مل سکتے! ایسا ممکن بھی ہوا تو پھر اس کو جرم کا مرتکب نہیں آرٹ اور کلچر کا مفتن یا محسن قرار دیں گے۔ پولیس کا کسی کو چالان کردینا ہی ثبوت جرم کے لیے کافی ہے۔ ہندوستانی عدالت پولیس اور اس کے گواہوں کو وہی اہمیت دیتی ہے جو ہندوستانی عوام ملّاؤں اور سیانوں کو دیتے ہیں۔ یعنی دونوں معصوم بھی ہیں، برگزیدہ بھی۔

ہر یوروپین پیدائشی فاتح ہے اور ہر ہندوستانی سرکاری گواہ یا اقراری ملزم اس طرح کے گواہ اس مصنف کی مانند ہوتے ہیں جو نازیبا خیالات و جذبات کا اظہار کرتا ہے لیکن اس بنا پر قابل مواخذہ قرار نہیں دیا جاتا بلکہ لائقِ تحسین سمجھا جاتا ہے کہ اس نے حقیقت کی ترجمانی کی یا ہندوستان اور ہندوستانیوں کی توہین! سرکاری گواہ کے بارے میں تو آپ جانتے ہوں گے کہ اکثر ایسا مجرم ہوتا ہے جس کے بیان پر دوسرے سزا پاتے ہیں اور خود وہ رہائی پاتا ہے!

جس طرح ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے صرف ایک قوم بنائی گئی ہے اسی طرح گواہ بننے کی صلاحیت ایک طبقے میں خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ یعنی پٹواری جس کو گاؤں کا غیر متشدّد آمر (ڈکٹیٹر) کہنا بجا ہوگا۔ انگریز کیک کھاتا ہے اور غرّاتا ہے۔ پٹواری گالی کھاتا ہے نذرانے لیتا ہے اور جو چاہتا ہے درج رجسٹر کرتا رہتا ہے۔ اس کو گاؤں میں وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو وکیلوں کو عدالت یا کلرکوں کو دفتر میں ہوتی ہے یعنی یہ سب جو چاہیں کرسکتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ جو چاہیں وہ ان کو ملتا رہے۔

گواہ کی حیثیت سے پٹواری کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ اگر یہ مثل صحیح ہے کہ بادشاہ سے کوئی غلطی سرزد نہیں

ہوسکتی تو یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ پٹواری کی توہین نہیں کی جاسکتی۔ پٹواری اس راز سے خوب واقف ہے اس کے بعد قومی لیڈر ہی اب تک جان سکا ہے کہ جب تک حلوہ مانڈہ ملتا ہے، توہین اور توقیر بے معنی الفاظ ہیں۔ جس طرح ہندوستانی کے لیے شادی اور فاقہ کشی ناگزیر ہے، پٹواری کے لیے گواہ بننا مقدر ہے۔ اس لیے وہ اپنے میلے بستے کے بہی کھاتوں میں ایسے اندراجات کرتا رہتا ہے، ''جو بوقت ضرورت کام آویں'' صوفیانہ کلام یا سیاسی دستاویزات کی مانند اس کے اندراجات ایسے ہوتے ہیں کہ جو چاہے جس طرح تعبیر کرے مواخذے سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے اور مواخذے میں آ بھی سکتا ہے!

لالہ چرونجی لال گاؤں کے پٹواری اور گنگا دین ایک غریب کسان تھا۔ ایک مقدمے میں گنگا دین کو لالہ جی کی گواہی کی ضرورت پیش آئی۔ گنگا دین کی ساری پونجی ایک گرا پڑا جھونپڑا تھا جس کی پردہ پوشی گوبھی اور کدو کی ہری ہری بیل، ان کے زرد اور سفید پھول اور صبح شام کی سنہری کرنیں تھیں۔ ایک طرف اُپلوں کا منڈپ تھا۔ دوسری سمت کھاد اور کوڑے کرکٹ کا گڈھا۔ چھپّر کے پیچھے کھیت تھا اور سامنے ساگ پات کی کچھ کیاریاں، زمیندار کسانوں پر اتنا ہی جری تھا جتنا لالہ چرونجی لال سے خائف۔ گنگا دین کے پاس کچھ مویشیاں بھی تھے جس میں گائے بیل بھیڑ بکری کے ساتھ اس کی بیوی بچے بھی شامل تھے۔

ہندوستانی کسانوں کو دیکھتے ہوئے یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کے بال بچے مویشیان ہیں یا مویشیان اس کے بال بچے۔

جب سے مقدمہ شروع ہوا تھا ساری معاش و ملکیت لالہ جی کے لیے وقف تھی۔ دودھ، دہی، ترکاری ان کی رسوئی میں جاتی گنگا دین چلم بھرتا تھا اس کی بیوی للائن کی خدمت گار تھی۔ لڑکے لڑکیاں لالہ جی کے بچوں کو کھلاتے بہلاتے۔ یوں تو ہر پٹواری عدالت کا کیڑا ہوتا ہے جب تک وہ عدالت کی زیارت نہ کرلے اس کی زندگی بے کیف و معنی رہتی ہے لیکن جب سے گنگوا کا مقدمہ شروع ہوا تھا لالہ جی نے عدالت کا ذکر وفکر کم کردیا تھا۔ گنگوا جب کبھی اس معاملہ کو چھیڑتا تو کہتے بھائی دن بُرے ہیں۔ تھانہ عدالت سے دور ہی رہنا اچھا پتاجی کا حال تو جانتے ہو سچی بات پر جیل خانہ کاٹنا پڑا کوئی سسرا کام نہ آیا۔ گنگا دین لالہ کے پاؤں پکڑ لیتا گڑگڑانا شروع کرتا اور جلد جلد ان کے پاؤں دبانے لگتا تو لالہ جی پاؤں ڈھیلے رکھتے لیکن زبان سے ہا ہا کہتے جس طور پر ڈاکٹر یا وکیل فیس کے لیے جیب ڈھیلی کرتا جاتا ہے لیکن زبان سے کہتا رہتا ہے ارے آپ یہ کیا کررہے ہیں یا اس کی کیا ضرورت تھی۔ لالہ کی نگاہیں گنگوا کی زمین چھپر اور مویشیوں پر تھیں اور گنگوا کی نظروں میں بیوی بچوں کی تباہی کا نقشہ پھر رہا تھا۔ بالآخر لالہ کی فتح ہوئی اور گنگوا دستاویزی غلام بنا۔ مقدمہ کی تاریخ آئی اور دونوں کچہری کو روانہ ہوئے۔

کچہری کا راستہ شہر سے گزرتا تھا۔ چلتے چلتے یکا یک لالہ کے قدم سست پڑنے لگے سامنے جوتے والے کی دکان تھی۔ لالہ جی کھڑے رہوگئے۔ فرمایا جوتا ٹوٹ گیا ہے۔ چلنا پھرنا دوبھر ہے۔ مہنگے سے روز روز شہر آنا نہیں ہوسکتا گنگوا سمجھ گیا۔اس نے دام ادا کیے لالہ جی نے جوتے قبضے میں کیے۔ دونوں آگے بڑھے کچھ دور چلے تھے کہ بزاز کی دکان آگئی۔ لالہ جی اس طرح رک گئے جیسے جوتے میں کنکری آگئی ہو جسے اطمینان سے نکالنا چاہتے ہوں بولے بھائی گنگوا اس پھٹی پرانی پگڑی میں عدالت کے سامنے گئے تو حاکم جلّاد ہے کھڑے کھڑے عدالت سے باہر نکلوادے گا۔ تمہارا کام کھٹائی میں پڑجائے گا۔ گنگوا گھبرایا کہنے لگا لالہ دیر ہورہی ہے عدالت میں پکار ہونے لگی ہوگی۔ ہرج کیا ہے واپسی میں لے لینا۔

لالہ جی نے تیوری بدل کر کہا اچھی کہی۔ تمہاری کوڑیوں کی خاطر اپنی لاکھ روپے کی آبرو پر پانی پھر جانے دوں۔ جاؤ نہیں

جاتے۔ ڈاکٹر گوکل پرشاد سے سرٹیفکیٹ لکھوا کر داخل کردیں گے کہ مسمّی لالہ چرونجی لال کو ہیضہ ہوگیا اس لیے حاضر عدالت نہ ہوسکا! گنگوا ہیضے کے امکان پر ابھی اچھی طرح خوش نہیں ہو پایا تھا کہ لالہ جی بزاز کی دکان کے سامنے تختے پراس طرح لیٹ گئے جیسے ہیضے میں مبتلا ہوجانے کا اعلان کررہے ہوں بالآخر پگڑی کا کپڑا خرید لیا گیا!

کچھ اور آگے بڑھے تھے کہ حلوائی کی دکان سامنے آئی۔ لالہ کچھ اس طرح رکے جیسے کوئی ضروری بات دفعتاً یاد آگئی ہو۔ فرمایا گنگا دین دیکھو کیسی چوک ہوئی جارہی تھی درگا جی کی پرشاد لینا بھول گئے۔ کسان توہم پرست ہوتا ہے جیسے ہم آپ مطلب پرست ایک طرف اس کی آنکھوں میں پورے کنبہ کی تباہی کا نقشہ پھر گیا دوسری طرف مقدمے کے انجام کا منظر سامنے آیا۔ کچھ نہیں بولا۔ لالہ جی کو سیر بھر جلیبی دلوادی یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ دونوں کچھ دیر تک خاموش چلتے رہے۔ گنگوا اس فکر میں مبتلا کہ لالہ کی سخت گیری کا یہی حال رہا تو دوپہر کے چبینے کے لیے بھی پیسے نہ بچیں گے۔ لالہ اس پھیر میں کہ گنگوا کو اور کس طرح نچوڑا جائے۔

معلوم نہیں گنگوا امید یا ناامیدی کی کس منزل میں تھا۔ لالہ کے ذہن رسانے جلد ہی کمان و کمیں دونوں متعین کرلیے۔ بولے اس پُردیّا نے ناک میں دم کر رکھا ہے مہینے بھر سے گھٹیا کا زور ہے تمہارا پیچ نہ ہوتا تو پریشر جانے اس حال میں کبھی گھر دوار نہ چھوڑتا۔ یہ کہتے کہتے ایک سایہ دار درخت کے نیچے انگوچھا بچھا کر لیٹ رہے اور اس چلم کا انتظار کرنے لگے جو ایک خونچہ والا پیے جارہا ہے۔ خوانچہ والے نے معزز مہمان کی توجہ کو اپنے لڈّو اور مرمروں کی طرف مائل کرانا چاہا۔ بولا لالہ کہ جل کھادا ہوجائے۔ ایسے سے کدھر آنکلے ذرا دم لو۔

گنگوا کا یہ حال کہ بس چلتا تو لالہ جی خوانچہ والا اور خوانچہ سب کو پاس کے کنوئیں میں ڈھکیل کر خود بھی کود پڑتا لیکن بے بسی وہ بلا ہے جو ہر طرح کے غم، غصّے اور غرور کو ٹھنڈا کردیتی ہے۔ گنگوا نے کہا لالہ جی ہم پر دیا کرو سورج دیوتا کہاں آئے۔ عدالت کب تک پہنچیں گے لالہ نے کراہ کر بے رخی سے جواب دیا۔ بھیا اپنے آپ کی سیوا نہ کریں تو کون بال بچوں کو دیکھے گا۔ تم عدالت جاؤ ہمارا تو پران نکلا جات ہے۔ ارے باپ رے ۔

خوانچہ والا بولا، لالہ دھیرج دھرو۔ یہ لو چلم پیو۔ کچھ کھا پی لو، عدالت میں بیان حلفی داخل کردینا۔ اس دوران میں ایک خالی یکّہ گزرا۔ خوانچہ والا بولا ارے بھائی لالہ جی کا جی اچھا نہیں ہے یکّے میں کیوں نہیں بٹھا لیتا۔ یکّہ والا رُک گیا۔ لالہ جی نے کروٹ بدلی۔ خوانچہ والے نے لالہ کولڈّو اور مرمرے کھانے اور ٹھنڈا پانی پینے کی دعوت دی یہ کہتے ہوئے کہ عدالت کا معاملہ ہے معلوم نہیں کب کھانے پینے کی نوبت آئے۔ گنگوا نے چند آنے خوانچہ والے کو نذر کیے لالہ جی یکّے والے کی دعوت پہلے سے قبول کرچکے تھے۔ ایک کراہتا، دوسرا کوستا دنوں یکّے میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔

عدالت میں پکار ہوئی۔ لالہ نے پگڑی اور بستہ سنبھالا۔ چپراسی لالہ جی کا آشنا نکلا۔ گردن میں ہاتھ دے کر ایک دشنام زیرلبی کے ساتھ جھونکا دیا تو لالہ جی گواہوں کے کٹہرے میں داخل تھے۔ شام تک سوال و جواب ہوتے رہے۔ لالہ جی نے موافقت میں گواہی دی نہ مخالفت میں۔ اس دوران میں عدالت، وکلاء، فریقین، چپراسی، حاضرین سب نے باری باری لالہ جی کو اپنی اپنی پسند کی گالیاں دیں طرح طرح سے ڈراتے دھمکاتے رہے لیکن لالہ کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی۔

کچہری برخاست ہوئی۔ لالہ باہر نکلے۔ یکّہ والوں کا ہجوم تھا۔ کسی پر ایک سواری تھی وہ دو اور کی فکر میں تھا۔ کسی پر دو تھیں وہ ایک کا متلاشی تھا۔ اس دھر پکڑ میں لالہ وارد ہوئے۔ سر پر نئی پگڑی، پاؤں میں نیا جوتا۔ ہاتھ میں دن بھر کا سمیٹا ہوا مالِ غنیمت، بغل میں غیر فانی لیکن ناشدنی بستہ، چاروں طرف سے چابک بدست لنگوٹی بند یکّہ والوں نے گھیر لیا۔ ایک نے بستہ چھین کر اپنے یکّہ پر رکھ لیا۔ دوسرے نے گٹھری اپنے قبضے میں کی۔ تیسرے نے خود لالہ کو پکڑ کر کھینچنا شروع کیا اور کچھ دور تک گھسیٹتا ہوا بھی لے گیا، اس رستا خیز میں پگڑی نے سر سے اور جوتے نے پاؤں سے مفارقت کی جن کو دوسرے یکّہ بانوں نے تبرکاً اپنے اپنے یکّوں پر رکھ لیا۔ یہ سب آنکھ جھپکاتے ہوگیا۔

اب جو دیکھتے ہیں تو میدان صاف تھا۔ سارے یکّے والے چل دیے تھے اور لالہ جی بیک بینی دو گوش اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے کہ دنیا کا آئندہ آشوب کون ہوگا۔ یکّہ بان یا پٹواری ۔

الفاظ و معانی

رستاخیز ہنگامی حالت **مفر** بھاگنے کی جگہ **اندراجات** درج ہونا، لکھا جانا، **عینی** دیکھا ہوا **انکشاف** ظاہر ہونا، کھلنا **مِفتن** فتنے میں ڈالنے والا **جری** بہادر **سامعی** سنا ہوا **متنفر** نفرت کرنے والا **متمنّی** تمنا کرنے والا **تنزّل** زوال **مواخذہ** جواب طلبی، گرفت **مرتکب** قصور وار، مجرم **مسلّم** پورا، کامل تسلیم کیا گیا **متلاشی** تلاش کرنے والا **کلو واشربو** کھاؤ پیو **دولِ متحارب** آپس میں لڑنے والے ممالک

مشق

1. سوالات کے جواب لکھیے :

(1) عدالت اور قیامت کے گواہ کون ہیں؟
(2) دولِ متحارب کا مقولہ لکھیے۔
(3) پولیس والوں کا دعویٰ کیا ہے؟
(4) ہندوستان میں گواہ کی کیا اہمیت ہے؟
(5) پٹواری کو غیر متشدّد کیوں کہا گیا ہے؟
(6) لالہ چرونجی لال کس کے گواہ بنے؟

2. تفصیل سے سوالات کے جواب لکھیے :

(1) گنگا دین کی زندگی پر منظر کشی کیجیے۔
(2) گواہ بننے پر لالہ گنگا کے ساتھ کس طرح پیش آیا؟
(3) لالہ کے قدم سست پڑنے لگے۔ جملہ سمجھائیے۔
(4) کچہری جاتے وقت گنگا دین کو کہاں کہاں رکنا پڑا؟
(5) کچہری برخاست ہونے کے بعد کا منظر بیان کیجیے۔

.3 جملہ کون کس سے کہتا ہے :

(1) ہرج کیا ہے واپسی میں لے لینا۔

(2) تمہاری کوڑیوں کے خاطر اپنی لاکھ روپے کی آبرو پر پانی پھر جانے دوں۔

(3) لالہ دھیرج دھرو۔ یہ لو چلم پیو۔

.4 دو معنی الفاظ لکھیے :

تعلیم کیف ذکر حسن عزت حالات تحسین

.5 محاوروں کے معنی بتا کر جملے بنایئے :

کھٹائی میں پڑنا دوبھر ہونا تیوری بدلنا سست پڑنا مائل کرنا نذر کرنا

.6 ششدر الفاظ میں لکھیے :

کھاوا آویں

.7 مرکب الفاظ کی ترکیب سمجھایئے :

خطرناک، فاقہ کشی، نگہداشت، تو ہم پرست

●

18	# گلِ نغمہ

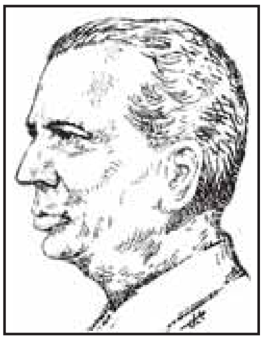

فراق گورکھپوری

پیدائش : 1896ء وفات : 1982ء وطن : گورکھپور

رگھوپتی سہائے نام اور فراق تخلص کرتے تھے۔ گورکھپور میں پیدا ہوئے اور یہی کی علمی و ادبی فضا میں ان کی ذہنی نشوونما ہوئی۔ والد شاعر تھے اور عبرت تخلص کرتے تھے۔ گھر پر ہی اردو سیکھنے سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ میور سینٹرل کالج الہٰ آباد سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں آزادی کی تحریک نئی طاقت سے ابھر رہی تھی۔ فراقؔ نے ملازمت کرنے کے بجائے تحریک آزادی میں شریک ہونا پسند کیا۔ جس کی پاداش میں انھیں جیل جانا پڑا۔

جیل سے رہائی کے بعد کانگریس کے انڈر سیکریٹری رہے۔ مختلف کالجوں میں پڑھاتے رہے۔ اسی دوران انگریزی میں ایم۔ اے کیا اور الہٰ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد ہوگئے۔

جدید شاعری میں اپنے منفرد لہجے کی وجہ سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ مغربی فنون و ادب اور ہندی شاعری کے وسیع مطالعہ کے اثرات ان کی غزلوں، نظموں اور رباعیوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ روح کائنات، رمز و کنایات، روپ اور گل نغمہ قابل ذکر ہیں۔ انھیں حکومت کی طرف سے ’’گل نغمہ‘‘ پر ’’گیان پیٹھ‘‘ کا انعام ملا ہے۔ فراق بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اردو غزل کو جو قدریں دی ہیں وہ نئی اور اہم ہیں اور اس طرح سے انھوں نے اردو غزل کا رخ موڑ دیا ہے۔

مجھ کو مارا ہے ہر اک درد و دوا سے پہلے
دی سزا عشق نے ہر جرم و خطا سے پہلے

آتش عشق بھڑکتی ہے ہوا سے پہلے
ہونٹ جلتے ہیں محبت میں دعا سے پہلے

فتنے برپا ہوئے ہر غنچۂ سر بستہ سے
کھل گیا راز چمن چاک قبا سے پہلے

چال ہے بادۂ ہستی کا چھلکتا ہوا جام
ہم کہاں تھے ترے نقشِ کفِ پا سے پہلے

اب کمی کیا ہے ترے بے سرو سامانوں کو
کچھ نہ تھا تیری قسم ترک و فنا سے پہلے

عشق بیباک کو دعوے تھے بہت خلوت میں
کھودیا سارا بھرم شرم و حیا سے پہلے

ہمسفر راہِ عدم میں نہ ہو تاروں بھری رات
ہم پہنچ جائیں گے اس آبلہ پا سے پہلے

پردۂ شرم میں صد برق تبسم کے نثار
ہوش جاتے رہے نیرنگ حیا سے پہلے

موت کے نام سے ڈرتے تھے ہم اسے شوق حیات
تونے تو مار ہی ڈالا تھا قضا سے پہلے

غفلتیں ہستئ فانی کی بتادیں گی تجھے
جو امر حال تھا احساس فنا سے پہلے

ہم انھیں پا کے فراقؔ اور بھی کچھ کھوئے گئے
یہ تکلف تو نہ تھے عہد وفا سے پہلے

الفاظ و معانی

بے سرو ساماں فقیر، کنگال **بیباک** بے خوف، آزاد **خلوت** تنہائی

مشق

1. سوالوں کے جواب لکھیے :

(1) ہر درد و دوا سے پہلے کس نے اور کیوں مارا ہے؟ سمجھائیں۔

(2) وہ کیا چیز ہے جو ہوا سے پہلے بھڑکتی ہے؟

(3) محبت میں دعا سے پہلے ہونٹ کیوں جلنے لگتے ہیں؟

(4) موت سے بڑھ کر شاعر کو کس چیز نے مار رکھا تھا؟

2. سمجھائیے :

موت کے نام سے ڈرتے تھے ہم اے شوق حیات
تونے تو مار ہی ڈالا تھا قضا سے پہلے

●

19 بزم شعرا اور مرحوم آزادؔ

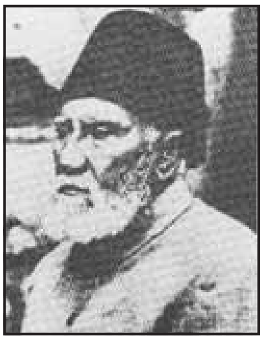

راشدالخیری

پیدائش : 1868ء وفات : 1936ء

اردو ناول کی تاریخ میں راشدالخیری کی ایک اہم جگہ ہے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبد الواحد تھا۔ حیدآباد میں ملازمت کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ راشد الخیری کے اسلاف کی وابستگی شاہان مغلیہ کے اساتذہ کی حیثیت سے تھی۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ڈپٹی نذیر احمد راشدالخیری کے چچا تھے۔ راشدالخیری کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب ان کی عمر بہت کم تھی۔ چنانچہ ان کی تربیت کا بار ان کے دادا کے سر آیا۔ چچا بھی معاونت کرتے رہے۔ انہوں نے عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم زمانے کے رواج کے مطابق گھر ہی پر حاصل کی، لیکن انگریزی کے لیے ایک اسکول میں داخل ہوئے۔ جب اس کی تکمیل ہوئی تو 1891ء میں سرکاری ملازمت اختیار کرلی اور اسی ملازمت سے ہمیشہ وابستہ رہے۔ 1910ء میں جب ملازمت سے الگ ہوئے تو تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا۔

راشدالخیری ڈپٹی نذیر احمد کے خاندان ہی کے نہیں بلکہ ان کی حیثیت ان کے اثرات قبول کرنے والوں کی رہی ہے۔ نذیر احمد نے عورتوں کی اصلاح کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا تھا۔ راشدالخیری انہیں اثرات کے تحت عورتوں کے مسائل کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے کئی رسالے جاری کیے۔ جن میں ''عصمت'' سب سے زیادہ مشہور ہے۔ عورتوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح کے لیے ایک ادارہ بھی قائم کیا جس کا نام تھا ''تربیت گاہ بنات''

دیکھنا-دیکھنا، برادرانِ وطن! کہیں ایسا نہ ہو کہ آنکھ جھپک جائے۔ بسا غنیمت ہے یہ وقت اور نعمت غیر مترقبہ یہ محفل رات گئی تو پھر ہاتھ آنے والی نہیں۔ چاند چمکے گا، تارے چھٹکیں گے، راتیں بہت سی آئیں گی اور جائیں گی، مگر تم کہاں اور یہ صورتیں کہاں۔ دلِ مجروح خون کے آنسو روئے گا۔ آنکھیں چاروں طرف ڈھونڈیں گی، مگر یہ سماں نظر نہ آئے گا۔

آج آبادی سے سات ساڑھے سات میل کے فاصلے پر اس گورستان میں جہاں چپّہ چپّہ اور کونہ کونہ بیش بہا جواہرات سے مالا مال ہے۔ وہ مقدس صورتیں جمع ہوئی ہیں، جن کے مبارک ہاتھ چمنستان اردو میں وہ پودے لگا گئے جو قیامت تک تر و تازہ رہیں گے اور وہ سدا بہار پھول کھلا گئے، جنھوں نے تمام دنیا کو معطر کردیا۔

رفتار زمانہ کے شیدائیو! ان چھجّے دار پگڑیوں اور لمبی ڈاڑھیوں کو دیکھ کر تعجب نہ کرنا، یہ شہر آبادی کے بسنے والے ہیں، ان کا لباس تیرہویں صدی ہجری کا نمونہ ہے، یہ وہ ہیں جو مرگئے، اور وضع کو ہاتھ سے نہ دیا۔ پیوند زمین ہوگئے، لیکن آن بان میں فرق نہ آنے دیا۔

یہ ان باکمال بزرگوں کا مجمع ہے، جو دلّی کی خاک سے اٹھے، یا سر زمین جہاں آباد میں اکتساب علم کیا۔ آسمان ادب پر چودھویں کا چاند ہوکر چمکے، اور بزم اردو میں ایسے فانوس روشن کرگئے، جو بھولے بھٹکے مسافروں اور اس منزل پر پہنچنے والوں کی ہمیشہ رہنمائی کریں گے۔

کسے خبر تھی کہ یہ قطعۂ آراضی جس پر آج شاہ جہاں کی نظر شفقت پڑ رہی ہے۔ ایک روز ان پاک روحوں کا مسکن ہوگا اور ان کے مقدس ہاتھ ایسی عمارتیں بنائیں گے جو روئے زمین پر بے نظیر ہوں گی۔

لو معزز سیلا نیو! دل کی آنکھیں کھولو، دیکھو دیکھو اور سنو۔ کیسی کیسی صورتیں سامنے ہیں۔ قلم ان کی توصیف میں مجبور، زبان ان کی مدح سے معذور، کس کی مجال ہے کہ ان کے احسانات کا حق ادا کرسکے۔ یہ ملک سخن کے تاجدار، عالم ارواح سے چل کر دینائے اجسام میں آئے ہیں، اور مرحوم آزادؔ کی ملاقات کے مشتاق ہیں۔ بیسویں صدی عیسوی کا دسواں سال شروع ہے۔ بائیسویں شب اس بلبل خوش الحان کو جس کی نغمہ سنجی کلیجے ہلا دیتی تھی، ہم سے جدا کررہی ہے۔ گو مرحوم آزادؔ کو اس خاک پاک میں سونا نصیب نہ ہوا، جس کا وہ دم واپسیں تک دلدادہ رہا۔ مگر اس کی روح جسد خاکی سے وداع ہوتے ہی ان قدر دانانِ سخن کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے۔

اللہ اللہ کیسے اچھے لوگ ہیں، ان کی باتیں سنو، اور ان کی صورتیں دیکھو، بزم اردو کے معزز مہمانو! تمہاری آنکھ بند ہونے کی دیر تھی زمانہ کچھ کا کچھ ہوگیا، وہ باتیں خواب و خیال ہوگئیں۔ تمہارے دامانِ شفقت سے جدا ہوتے ہی بدنصیب اردو پر وہ ستم ٹوٹے، کہ زندگی و بال ہوگئی۔ اغیار کی، بے اعتنائی کا ذکر نہیں گھر کے بھیدیوں نے وہ لنکا ڈھائی کہ چھکّے چھڑا دیئے۔ نتھرے نتھرے صاف شفاف پانی کے چشمے میں کھاری بد ذائقہ میلے کچیلے ملاؤ نے اصلی آب و تاب غارت کردی۔ تمہاری آنکھیں دیکھی ہوئی دو چار صورتیں بہتیرا تڑپیں، اور پھڑ پھڑائیں، مگر کون سنتا تھا جس پودے کو تم نے اپنے خون جگر سے سینچ کر رنگ برنگ کے پھول کھلائے۔ آج اس کا خدا حافظ ہے۔

سنگلاخ زمین کو دم بھر میں گلزار بنا دینے والے بزرگو! کہاں ہو، کدھر ہو، قلعہ معلٰی کی بھری پری بیگم، لٹی کھٹی تمہارے دربار میں ہے اس کی فریاد سنو اور انصاف کرو۔ یہ محلوں کی رہنے والی آج دربدر ماری ماری پھر رہی ہے، اور کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ تمہاری بدولت اس نے بڑی بڑی سلطنتوں پر حکومت کی اور ایک عالم میں اس کا ڈنکا بجا۔

عالم ارواح کے ستارو! تمہارا ہی طفیل تھا کہ اس کے حُسن کو چار چاند لگے، نزاکت اس کی لونڈی، فصاحت اس کی چیری، بلاغت اس کی زرخرید۔ تمہارا منہ موڑنا تھا، کہ اس کی چمک ماند، اس کی رنگت پھیکی، اس کی آب و تاب ختم، اس کی روشنی مدّہم، غرض سارے جوہر زائل ہوگئے۔

کیسا پُر لطف سماں اور بہار کی محفل ہے۔ میرؔ، سوداؔ، دردؔ، سے لے کر داغؔ تک تمام سخن ور موجود ہیں۔ یہ وہ فقیر ہیں جو مرکر قلیم سخن کے بادشاہ ٹھہرے۔ گو زمانہ نے جیتے جی ان کی قدر نہ کی، مگر ان کے دماغوں سے ایسے چشمے پھوٹے کہ خلق اللہ ہمیشہ ہمیشہ سیراب ہوگی۔

کرسی صدارت پر میرؔ صاحب رونق افروز ہیں۔ غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ اور ان کے ساتھ وہ تمام شعرائے باکمال جن پر دلّی ناز کررہی ہے تشریف فرما ہیں۔ دفعتاً شمس العلماء آزادؔ کی تشریف آوری کا غلغلہ بلند ہوا۔ کشتی زرنگار میں خلعت ہفت پارچہ رکھا تھا۔ آزادؔ کا داخل ہونا تھا، کہ خوش آمدید کے نعرے لگاتے ہوئے اہل محفل تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ ذوق سے بڑھے، شوق سے لائے، ملک الشعراء خاقانیؔ ہند نے میرؔ صاحب کی اجازت سے خلعت پہنایا، سب نے مبارکباد دی۔ اس کے بعد حضرت داغؔ